شاہراہِ آزادی

جی۔ایم میر



شاہراہِ آزادی

جی۔ایم میر



اظہارِ ناشر

کشمیر کی تاریخ کے بارے میں بھارت کے عظیم سکالر ڈاکٹر رادھا کرشنن کا کہنا تھا کہ

"کشمیر وہ خطہ ہے جسے اپنی ہزاروں سال پر محیط ریکارڈ شدہ تاریخ پر فخر کرنا چاہیے جبکہ بھارت کو اپنے ماضی کا کھوج لگانے کیلئے رامائن اور مہابھارت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔"

مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کو کشمیر کی تاریخ سے بہت دلچسپی تھی اور اس میں تحقیق اور تجسس کا مادہ بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ اس نے لکھا۔

"کشمیر پر چار ہزار سال تک ہندو راجے حکومت کرتے رہے ہیں اور ورودِ اسلام کے بعد 28 مسلمان بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔"

(مکمل تاریخ کشمیر، محمد دین فوق، صفحہ: 625 تا 630)

تاریخ نویسی کا فن کشمیر میں ہر دور میں جاری رہا ہے۔ 1148ء میں پنڈت کلہن نے راج ترنگنی کے نام سے سنسکرت زبان میں کشمیر کی تاریخ لکھی۔ پندرھویں صدی میں سلطان زین العابدین (بڈشاہ) کے دورِ حکومت میں راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ انگریزی اور فرانسیسی سمیت راج ترنگنی کا کئی زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ 1972ء میں کشمیر کے دانشور ڈاکٹر صابر آفاقی نے بھی راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ کیا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور 1974ء میں مرکزِ تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان نے اس کتاب کو اسلام آباد سے شائع کیا۔

ہمارے دور کے کشمیر کے محقق اور مؤرخ جناب جی ایم میر نے تاریخ نویسی کے اس فن کو جاری رکھا ہوا ہے۔ گزشتہ 30 سال میں ان کی 10 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں سے ہم صرف دو کتابوں کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

بھارتی حکمران 1947ء سے ہی "کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔" کا دعویٰ کرتے رہے





ہیں۔ میر صاحب نے اس دعوے کے ابطال کیلئے ''کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی اور مختلف ادوار کے نقشوں کی مدد سے ثابت کیا کہ تاریخ میں انگریزوں کے تسلط سے پہلے کشمیر بھارت کا کبھی اٹوٹ انگ نہیں رہا بلکہ ایک آزاد و خود مختار حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اسی طرح پاکستان کے حکمران یہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور اب کچھ عرصے سے یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ ''مسئلہ کشمیر تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا ہے۔'' نامکمل ایجنڈا والی فلاسفی سب سے پہلے سابق صدر غلام اسحٰق خان نے 1990ء میں ایجاد کی۔ اس کے بعد 8 جولائی 1994ء کو اسلام آباد میں پروفیسر ولیم بیکر کی کتاب ''کشمیر وادیٔ مسرت وادیٔ موت'' کی رسم افتتاح سے خطاب کرتے ہوئے اس وقت کے صدر فاروق احمد خان لغاری نے کہا ''ہم تقسیم ہند کے نامکمل ایجنڈا کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔'' 22 جولائی 1996ء کو جرمن پارلیمانی وفد سے بات چیت کرتے ہوئے صدر فاروق احمد خان لغاری نے ایک بار پھر اس بات پر زور دیا کہ ''مسئلہ کشمیر تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا ہے۔'' 13 اکتوبر 1998ء کو میر پور میں جیورسٹ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ نے بھی اپنی تقریر میں یہ دعویٰ دہرایا کہ ''مسئلہ کشمیر تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا ہے۔''

ہمارے مؤرخ جی ایم میر نے 1997ء میں امریکہ کی پنسلوانیا یونیورسٹی کی لائبریری میں تقسیم ہند کے بارے میں دستاویزات کا تفصیل سے مطالعہ کیا اور واپس آ کر ''کیا مسئلہ کشمیر تقسیم ہند کا نامکمل ایجنڈا ہے؟'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے خاتمۂ کلام میں انہوں نے یہ حقائق قلم بند کیے۔

- 3 جون 1947ء کو حکومت برطانیہ نے تقسیم ہند کا اعلان کر دیا۔
- 9 جون 1947ء کو مسلم لیگ نے حکومت برطانیہ کے 3 جون والے پلان کی منظوری دے دی۔
- 15 جون 1947ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی اسے منظور کر لیا۔
- 27 جون 1947ء کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس تجویز سے بھی اتفاق کیا کہ سر سیرل ریڈ کلف کو حد بندی کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا جائے۔
- 29 جولائی 1947ء کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حکومت برطانیہ کو یہ رپورٹ بھیجی کہ دونوں حکومتوں نے باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ کو تسلیم کرنے کا عہد کر لیا ہے چاہے یہ

ایوارڈ کچھ بھی ہو۔

- 15 اگست 1947ء کو پاکستان اور بھارت کی نئی مملکتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح تقسیم ہند کا ایجنڈا مکمل ہو گیا اور انگریز یہاں سے رخصت ہو گئے۔

اب جس موضوع پر ہمارے واجب الاحترام قلم کار جی ایم میر کام کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ 1586ء میں مغل اعظم کے کشمیر پر قبضہ سے آج تک، تمام قابضین کی یہ کوشش رہی ہے کہ ہمارے ارض عزیز کو آپس میں بانٹ لیا جائے جبکہ غیرت مند کشمیری عوام ان کوششوں کو ناکام بنانے میں سرگرم ہیں۔

نامکمل ایجنڈا کے بارے میں اپنی کتاب میں میر صاحب نے ان حقائق کو بے نقاب کیا ہے جو بھارت اور پاکستان کے حکمران کشور کشمیر کی بندر بانٹ کیلئے کرتے رہے ہیں۔

- قائداعظم کی وفات کے بعد وزیراعظم لیاقت علی خان نے پنڈت نہرو کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ جن بنیادوں پر برصغیر تقسیم ہو گیا ہے اور جن اصولوں کے تحت پنجاب اور بنگال کے صوبوں کی تقسیم عمل میں آئی ہے۔ انہی بنیادوں پر کشمیر کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس بات کا انکشاف ایلسٹر لیمب نے لندن میں کیا۔

(روزنامہ جنگ لندن، 9 فروری 1994ء)

- پاکستان کے وزیراعظم فیروز خان نون نے وزارت عظمیٰ سے فارغ ہونے کے بعد اپنی سوانح حیات ''چشم دید'' میں لکھا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے میری دانست میں بہترین حل یہ ہے کہ چناب لائن پر بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کو تقسیم کر دیا جائے۔
- 1962ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے پاک ہند تعلقات بحال کرنے کیلئے ''کچھ لو اور کچھ دو'' (Give and take) کی بنیاد پر مذاکرات کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ اور پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان مذاکرات کے چھ دور ہوئے۔ لیکن یہ مذاکرات بے نتیجہ رہے۔ یہ مذاکرات جو کہ کچھ لو اور کچھ دو کے نظریہ کے تحت ہوئے تھے تقسیم کشمیر کی غمازی کرتے تھے۔

(کرنل جاوید محمود، اوصاف، 23 جون 1998ء)

1971ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد مسز اندرا گاندھی اور ذوالفقار علی بھٹو کے مابین ایک

معاہدہ عمل میں آیا جو شملہ معاہدہ کہلایا۔ اس معاہدے میں سیز فائر لائن کو لائن آف کنٹرول کا نام دیا گیا۔ ہزارہ ٹائمز کے مدیر شمس کشمیری اپنی کتاب ''نیا کشمیر'' میں لکھتے ہیں۔

''بھٹو اور اندرا گاندھی کے مابین کشمیر کی تقسیم پر اتفاق ہو گیا تھا۔ لیکن بھٹو صاحب اسے برملا کہنے اور ضبطِ تحریر میں لانے پر راضی نہ تھے۔''

اس کتاب کے ذریعے میر صاحب نے آزاد دنیا کو یہ بتانا چاہا ہے کہ دورِ غلامی کے آغاز 1586ء سے اب تک کشمیری قوم اپنی آزادی و خودمختاری کی منزل تک پہنچنے کیلئے ہر پہلو سے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

کشورِ کشمیر کے موجودہ قابضین بھارت اور پاکستان کے حکمران اب اس جنتِ ارضی کو آپس میں بانٹنے کیلئے جو جتن کر رہے ہیں وہ اب بھی جاری ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف نے گلگت بلتستان کو قانون سازی کا حق دینے کا جو اعلان کیا ہے وہ بھی تقسیمِ کشمیر کی بے سود کوشش ہے جس میں وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے 1947ء میں کہہ دیا تھا:

''میری رائے میں ریاستیں اپنی مرضی کے مطابق خود مختار رہ سکتی ہیں۔ حکومت برطانیہ یا برطانوی پارلیمینٹ یا کوئی اور طاقت یا کوئی ادارہ ریاستوں کی خواہشات اور مرضی کے منافی ان پر کوئی فیصلہ عائد نہیں کر سکتا۔ نہ ہی کسی کو ایسا کرنے کا حق یا اختیار حاصل ہے۔''

(پاکستان ٹائمز۔ 18 جون 1947ء)

چوہدری محمد اشرف

....

ابتدائیہ

آزادی ہر جاندار شے کیلئے ایک لازمی ضرورت ہے۔ انسانوں کے علاوہ حیوان اور پودے بھی آزادی کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں اور پابندی سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

انسان نے ابتدائے آفرینش سے ہی سب سے پہلے فطرت کی ظالم قوتوں کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ سردی، گرمی، بارش، طوفان، پھر اپنے سے طاقتور جنگلی جانوروں سے بچاؤ کی ترکیبیں اختیار کیں۔ حتیٰ کہ ایک اجتماعیت، ایک خاندان، ایک معاشرہ، ایک سوسائٹی وجود میں آئی۔ کیونکہ اکیلا انسان ان طاقتور عناصر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

سوسائٹی کے وجود میں آنے سے فائدے کے ساتھ ایک نقصان بھی ہوا، طاقتور قبیلے یا گروہ کمزور قبیلوں یا گروہوں کا استحصال کرنے لگے۔ چنانچہ اب انسان کا اپنے ہی ہم جنسوں کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ یہ جدوجہد آج تک جاری ہے۔ روئے زمین پر آج بھی طاقتور ممالک نے کمزور قوموں کو غلام بنا رکھا ہے اور کمزور اقوام اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

آزادی کا تصور ہزاروں سال سے بدلتا رہا ہے۔ ترقی کرتا رہا ہے۔ بلوچستان کے مشہور عوامی رہنما عبدالصمد خان اچکزئی اپنی کتاب ''آزادی کا افق'' میں لکھتے ہیں۔

''آزادیٔ ملک کے بعد جو طبقہ آسودہ زندگی سے ہم کنار ہوا۔ ان کے نزدیک یہی آزادی ہے لیکن ملک کی اکثریت آسودہ زندگی سے اس طرح محروم رہی جیسے انگریزوں کے دورِ اقتدار میں تھی۔ قافلۂ آزادی میں شریک لوگ تو ایسی آزادی کے متمنی تھے جس میں لوگوں کی اکثریت کی خزاں زدہ زندگی میں بہار آئے۔ لیکن آزادی کی موجودہ منزل ایک سراب ثابت ہوئی۔ کم از کم ان لوگوں کیلئے قطعی طور پر سراب ہے جنہوں نے مفلسی، ناداری، جہالت اور ماحول کے قہر میں آنکھیں کھولیں اور اس

قہر آلود زندگی سے انہیں صرف موت ہی نجات دلا سکتی ہے۔"

(آزادی کا افق)

آزادی کے مفہوم پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے اچکزئی مرحوم لکھتے ہیں۔

"آزادی ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی اور مطلب ہر طبقہ اور ہر فرد اپنے زاویہ نگاہ سے نکالتا ہے۔ ایک بے روزگار، ایک مفلس کیلئے آزادی کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ اُسے روزگار ملے اور مفلسی کی بے بسی سے نجات۔ لیکن ایک صاحبِ املاک اور ایک دانشور کے نزدیک آزادی کا مطلب ہے کہ اُس کی املاک میں اضافہ کے ذرائع پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو۔ دانشور کو مال و دولت کے علاوہ معاشرے میں عزت کا مقام حاصل ہو۔"

"انفرادی آزادی کے اس زاویہ نظر کے بعد قومی اور ملکی آزادی کو لیجئے۔ اس کے مطالب میں بھی تضاد ہے۔ نو آزاد ممالک جنہیں اب ترقی پذیر ممالک کے نام سے پکارا جاتا ہے، ان کے برسر اقتدار طبقہ کے نزدیک آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ صنعت کاری کیلئے مالدار ممالک سے قرض یا امداد لے کر اپنے طبقے کو مستحکم کر کے ملک کی معاشیات پر مکمل گرفت کر سکے۔ ایسے ممالک میں مفلس، بے روزگار اور مزدور لوگوں کے نزدیک آزادی کے معنی اُن کی معاشی حالت میں نمایاں بہتری ہے۔ ان ممالک میں ایک تیسرا گروہ بھی موجود ہے جسے عام طور پر سیاستدان کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادی کا مطلب ہے نئی سیاسی پارٹیوں اور گروہ کی تشکیل کی آزادی ہو۔ برسرِ اقتدار طبقہ سے مفاہمت کرنے اور اقتدار میں حصہ لینے کی آزادی ہو......"

(آزادی کا افق۔ص 235-234)

اب سوال یہ ہے کہ اصل میں آزادی کا مطلب ہے کیا؟ علم و آگہی کی ترقی اور تجربات کی وسعت نے آزادی کے مفہوم کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ آج جب ہم آزادی کی بات کرتے ہیں تو

اس سے مراد صرف غیر ملکی حکمرانوں سے سیاسی آزادی نہیں۔ بلکہ اس سے ایسی آزادی مقصود ہوتی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو جس میں سیاسی آزادی، سماجی آزادی، تہذیبی آزادی، اقتصادی آزادی اور ذہنی آزادی شامل ہے۔ آزادی کا یہ تصور ہزاروں سال کی سوچ و بچار کا نچوڑ ہے اور بہت ترقی یافتہ تصور ہے جبکہ آج سے چند صدیاں قبل تک یہ تصور مفقود تھا۔

23 جولائی 1989ء کو صدر پاکستان جناب غلام اسحٰق خان نے کوئٹہ میں سماجی کارکنوں کی تیسری کل پاکستان کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس خطاب میں انہوں نے آزادی کے تصور کی نہایت دل نشیں پیرایہ میں یوں تشریح کی۔

"میرے نزدیک آزادی زندگی کی روح ہے۔ غلامی میں زندگی بقول اقبال گھٹ کے جوئے کم آب رہ جاتی ہے، جبکہ آزادی اِسے بحرِ بیکراں بنا دیتی ہے مگر آزادی ہے کیا؟ کیا محض سیاسی خودمختاری کو آزادی کہا جا سکتا ہے۔ یقیناً غیروں کی محکومی سے نجات، آزادی کی بنیادی شرط ہے۔ مگر حقیقی آزادی اس سے کہیں وسیع تر مفہوم رکھتی ہے۔ اس میں سیاسی خودمختاری بھی شامل ہے۔ اقتصادی خود انحصاری بھی اور حُریت فکر بھی اس کا لازمہ ہے اور معینہ مدت میں آزادیٔ عمل بھی۔ یہ منزلوں کے انتخاب کے اختیار کا نام بھی ہے۔ اور سفر کی راہوں اور رفتار کے تعین کی صلاحیت بھی۔ اگر آزادی اپنے وسیع تر مفہوم سے محروم ہے تو لفظوں کی شعبدہ گری کے سوا اور کچھ نہیں۔"

صدر اسحٰق نے آگے چل کر فرمایا:

"افراد کی طرح قوموں کی کامیابی بھی خود اعتمادی سے مشروط ہے جب تک ایک قوم اپنے وسائل سے اپنے مسائل حل کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کر لیتی۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد قوم نہیں گردانی جا سکتی۔ کون نہیں جانتا کہ دوسروں کی دائمی محتاجی حقیقی آزادی کی ضد ہے۔ جو قوم اپنی بقاء کیلئے دوسروں کی دست نگر رہتی ہے۔ وہ محض انسانوں کا انبوہ ہوتی ہے۔

قوم نہیں......"

کشمیری قوم ایک طویل عرصہ سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہے لیکن ملک کے مختلف خطوں میں مفاد پرست عناصر اور مختلف نکتۂ نظر رکھنے والے سیاسی ٹولوں نے اس جدوجہد کے مقاصد یعنی آزادی کو اپنے اپنے رنگ کے معنی پہنائے ہیں۔ جن کا حقیقی آزادی کی روح سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اگلے صفحات میں ہم آزادی کی دیوی کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ اُس کی تلاش میں سرگرداں نوجوانوں کو اُس کے پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے اور وہ گندم نما جوفروش سیاسی شعبدہ بازوں کے فریب میں آکر اپنی صلاحیتیں اور اپنی انرجی بے سود ضائع نہ کرتے رہیں۔

جی۔ ایم۔ میر

RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF



غیر ملکی تسلط سے آزادی

ماضی میں اکثر بڑے ممالک محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے کمزور ہمسایہ ممالک پر اپنا تسلط قائم کر کے انہیں اپنا غلام بناتے رہے ہیں۔ نہ صرف ہمسایہ ممالک بلکہ دور دراز کے طاقتور ممالک تک چھوٹے ممالک کو اپنے زیر نگیں لا کر ان کی آزادی سلب کرتے رہے ہیں۔ ماضی قریب کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیسیوں ممالک نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد مغربی طاقتوں کی غلامی سے نجات پائی ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، سپین اور پُرتگال نے افریقہ اور مشرق بعید تک بہت سے ممالک کو اپنا غلام بنائے رکھا تھا۔ ان میں سے بعض ممالک کئی کئی سو سال تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے ہیں۔ مغرب کے ان طاقتور ممالک کو سامراجی یا استعماری ممالک اور ان کے اس رویہ یا سیاست کو سامراج یا امپیریلزم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے زمانہ حال میں بعض نو آزاد شدہ ممالک نے بھی اپنے کمزور تر پڑوسی ممالک سے یہی برتاؤ روا رکھا ہے اور ان کے اس رویے سے "Neo Colonialism" اور "Neo Imperialism" یعنی نو استعماریت وغیرہ کی اصطلاحیں وجود میں آگئی ہیں۔

ایک بڑا ملک جب کسی چھوٹے ملک پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے تو اسے اس چھوٹے ملک کے ہر شعبہ زندگی پر مکمل اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ وہاں کی سیاست، معیشت، انتظامیہ اور عدلیہ، ذرائع پیداوار اور ذرائع آمدورفت غرض کہ ہر چیز پر قابض ملک کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر اس غلام یا مقبوضہ ملک کے عوام اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں قابض ملک کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ سامراجی ملک اپنے مقبوضہ علاقوں میں اپنے مفاد کے مطابق حکومت چلاتا ہے۔ عوام کے مفاد سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ تعلیم کا بندوبست ان خطوط پر اور صرف اس قدر کیا جاتا ہے کہ مقامی حکومت چلانے کیلئے کارندے دستیاب ہو سکیں۔ رسل و رسائل کو صرف اس حد تک ترقی دی جاتی ہے۔ جس حد تک اپنا تسلط قائم رکھنے کیلئے ضروری ہو۔ مثال کے طور پر بھارت نے کشمیر کے اپنے

مقبوضہ علاقے میں دور دراز دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں سڑکوں کا جال بچھایا ہے اور بانہال کے فلک بوس پہاڑ کو کاٹ کر جواہر ٹنل کے نام سے 5 کلومیٹر لمبی ایک سرنگ تعمیر کی ہے تو اس کا واحد بنیادی مقصد یہ ہے کہ ضرورت کے وقت بھارتی افواج کو کسی جگہ پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ان ذرائع آمد و رفت سے عوام کو بھی کچھ فوائد حاصل ہیں۔ دوسری جانب پاکستان کی حکومت نے ساٹھ سال گزر جانے کے باوجود آزاد کشمیر کو گلگت اور بلتستان سے ملانے کیلئے کوئی سڑک تعمیر نہیں کی۔ اگرچہ عوام کے مفاد میں ایسی ہمہ موسمی سڑک کا ہونا از حد ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمرانوں نے گلگت بلتستان تک پہنچنے کیلئے براہ راست رابطے قائم کر لئے ہیں اور وادیٔ نیلم کے راستے گلگت پہنچنے کی اُن کو ضرورت نہیں ہے اور چونکہ یہ بات ان کے مفاد میں جاتی ہے کہ گلگت اور کشمیر کے عوام کا آپس میں براہ راست کوئی رابطہ نہ ہو اس لیے رسل و رسائل کے ذرائع پر دانستہ کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

اِسی طرح صنعتی ترقی کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے تاکہ سامراجی ملک کے اپنے کارخانے متاثر نہ ہوں اور مقبوضہ ملک اُن کیلئے ایک منڈی کا کام دیتا رہے۔ سامراجی ملک اپنے مقبوضات کے ذرائع کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے اور اس سے فوائد حاصل کرتا رہتا ہے۔ مقبوضہ ملک میں اپنے شہریوں کیلئے اعلیٰ و اوسط ملازمتوں کے مواقع نکالے جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں مقبوضہ جات کے عوام روز بروز بیروزگاری کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ الغرض ہر ممکن طریقہ سے قابض ممالک اپنی نوآبادیات کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔

چنانچہ غلام ممالک میں جو تحریکیں آزادی کیلئے ابھرتی ہیں۔ اُن کا سب سے پہلا مقصد اپنے سامراجی آقاؤں سے سیاسی آزادی حاصل کرنا ہوتا ہے کیونکہ سیاسی آزادی حاصل کیے بغیر دوسری آزادیوں کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر ہندوستان نے دو سو سال کی طویل جدوجہد کے بعد سامراج کو نکال باہر کیا۔ مشرق بعید میں انڈونیشیا، ویت نام، برما، تھائی لینڈ اور چین طویل جدوجہد کے بعد غیر ملکیوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ موزمبیق تقریباً پانچ سو سال تک غیر ملکی غلامی میں رہا۔ لیبیا، الجزائر اور افریقہ کے بہت سے دوسرے ممالک مختلف سامراجی طاقتوں کی غلامی سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ کئی ممالک میں آزادی کی تحریکیں ابھی جاری ہیں۔

جموں کشمیر 1586ء سے قبل ہزاروں سال تک آزاد و خودمختار حیثیت سے باعزت مقام کا حامل رہا ہے۔ اچھی اور بری حکومتیں آتی اور جاتی رہی ہیں۔ سرحدوں میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ لیکن کشمیر غیر ملکی غلامی سے آزاد رہا ہے۔ 1586ء میں پہلی بار مغل شہنشاہ اکبر نے پے در پے آٹھ حملوں کے بعد کشمیر کو تسخیر کیا۔ ان حملوں کا حال ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد افغانوں اور سکھوں کے تسلط کا احوال پیش کیا جائے گا۔

RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF)



(الف) کشمیر پر مغلوں کی جارحیت اور ہماری غلامی کا آغاز

(1586ء سے 1753ء تک۔ 167 سال)

1586ء کشمیر کی تاریخ کا وہ منحوس ترین سال تھا جب مغل شہنشاہیت نے بار بار کی جارحیت کے بعد آخر کار اس جنت ارضی کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس واقعہ پر کشمیر کے اہل قلم مورخ تو خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے۔ البتہ کشمیری زبان کے عظیم دانشور پروفیسر محی الدین حاجنی کشمیری قوم کے بے پناہ تشکر کے مستحق ہیں جنہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ مغل شہنشاہیت کے کشمیر پر پے در پے حملوں کا حال قلم بند کیا۔ انہوں نے کشمیری زبان میں اپنے مقالہ کا نام ''کشیرہ پیٹھ موغلن ہند حملہ تہ قبضہ'' (کشمیر پر مغلوں کے حملے اور قبضہ) رکھا۔ اس مقالے کو ہم پہلے ہی اردو زبان میں شائع کر چکے ہیں۔

پروفیسر محی الدین حاجنی کے اس مقالہ سے استفادہ کرتے ہوئے ہم اس کی جزیات قارئین کے ملاحظہ کیلئے پیش کر رہے ہیں۔

کشمیر پر مغلوں کا پہلا حملہ

مغلوں سے پہلے ہندوستان پر لودھی خاندان کی حکمرانی تھی۔ لیکن پھر شہنشاہ بابر نے لودھی خاندان کو شکست دے کر ہندوستان پر مغلوں کی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ مغل خاندان ہندوستان میں اپنی سلطنت کو مشرق اور جنوب کی طرف وسعت دینا چاہتا تھا۔



RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)

scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF)



شہنشاہ بابر کو کشمیر پر حملہ کرنے کا خیال آیا۔ اس نے کوچک بیگ ازبکی اور شیخ علی ترک کی کمان میں کشمیر کو فتح کرنے کیلئے ایک بڑی فوج بھیجی۔

یہ فوج نوشہرہ پہنچی۔ یہاں کشمیر کا ایک مدبّر لیڈر کاجی چک موجود تھا۔ اس نے آس پاس کے علاقوں سے کچھ سپاہ اکٹھی کر لی۔ مغل افواج کیساتھ پہلا معرکہ یہیں ہوا۔ کاجی چک کے دونوں بیٹوں حسین خان چک اور غازی خان چک نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے مغل افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جوابی حملوں سے مغلوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ اس معرکے میں مغل فوجیوں کی کھوپڑیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جو باقی بچے وہ اپنی جان بچا کر بھاگ گئے۔

مغلوں کو شکست دے کر کاجی چک کشمیر آیا تو اس کا شاندار استقبال ہوا۔ بادشاہ محمد شاہ نے اسے اپنا مصاحب بنالیا۔ یہ واقعہ سلطان محمد شاہ کے چوتھے دورِ اقتدار میں پیش آیا جو کہ 1517ء سے 1527ء تک رہا۔

(محمد دین فوق، مکمل تاریخ کشمیر ص 401)

کشمیر پر مغلوں کا دوسرا حملہ

پہلی شکست سے مغل خار کھائے بیٹھے تھے۔ کشمیر جیسا چھوٹا سا ملک تاتاری بہادروں کو شکست دے یہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ نوشہرہ کے دو کشمیری امیروں علی رینہ اور ریگی چک نے اپنی مرضی سے ابراہیم ماگرے کو شہنشاہ بابر کے پاس مدد مانگنے کیلئے بھیجا۔ ماگرے کی بہت آؤ بھگت ہوئی اور 20 ہزار مغل افواج سلطان ابراہیم شاہ کو تخت سے اتارنے کیلئے کشمیر روانہ کی گئی۔ یہ فوج بظاہر کشمیر کو خانہ جنگی سے بچانے کیلئے اور اصل میں کشمیر کو مغل سلطنت کا حصہ بنانے کی غرض سے پڑاؤ کرتی ہوئی ''بانگل (Bangil)'' کے مقام پر پہنچی۔ بانگل کے مقام پر دونوں افواج ایک دوسرے کے سامنے آگئیں۔ اسی دوران ایک ترک سپاہی جو کاجی چک سے لڑنے کی ہوس لیکر دہلی سے آیا تھا۔ میدان میں آیا اور یوں نعرہ زن ہوا کہ ''کاجی چک کجاست۔ کجاست کہ با او جنگے کنم'' (کاجی چک کہاں ہے کہ میں اس سے دو دو ہاتھ کر سکوں) یہ نعرہ کاجی چک نے سنا تو وہ اس جوان رعنا کے مقابل آگیا۔ ترک شیر ببر کی طرح لپکا اور کاجی چک پر حملہ آور ہوا۔ کاجی چک نے غضب ناک ہو کر ایک نیزہ اس زور سے ترک سپاہی کے سینے میں مارا کہ وہ سینے

کی دوسری جانب جا نکلا۔ کاجی چک نے نعرہ لگایا ''ہمیں است کاجی چک کہ از آگرہ تا بکشمیر برائے جان خود می تلبیدی'' (یہ ہے کاجی چک جس کی جان کے پیچھے تم آگرہ سے کشمیر تک تلاش میں تھے) سلطان ابراہیم شاہ کا یہ دور حکومت ایک سال 11 ماہ 1527ء سے 1529ء تک رہا۔

(مکمل تاریخ کشمیر۔ محمد دین فوق۔ صفحہ نمبر 40)

کشمیر پر مغلوں کا تیسرا حملہ

ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ مغل شہنشاہ بابر کا بھائی کامران مرزا بابر کی اجازت سے کشمیر پر حملہ کرنے کیلئے روانہ ہوا۔ یہ 1531ء کا واقعہ ہے۔ کشمیر میں یہ شاہمیری سلطان محمد شاہ کا پانچواں دورِ حکومت (1529ء سے 1536ء تک) تھا کامران مرزا تین ہزار جانباز سواروں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ نوشہرہ پہنچ کر اس نے قیام کیا۔ یہاں مرزا محرم بیگ تاشلقی اور شیخ علی ازبکی مغل کو افواج کا کمانڈر مقرر کیا۔

محرم بیگ نے کامران مرزا کی خدمت میں ایک صلح نامہ لکھا جس کے دو اشعار یوں تھے۔

سفر کردم بسوئے ملک کشمیر
کہ از خوبی دہد تعلیم فردوس

چو کردم فتح نیم او بتاریخ
خرد گفتا کہ فتح نیم فردوس

یعنی میں نے ملک کشمیر کی طرف سفر کیا کیونکہ اس خوبصورت زمین سے فردوس بریں کی خوشبو آتی ہے جب ہم نے اس سرزمین میں سے آدھا فتح کر لیا تو عقل نے کہا کہ نصف جنت فتح ہو گئی ہے۔

کشمیری مغلوں کے ارادے جان گئے اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ جب اہل کشمیر اپنے سارے اختلافات ایک طرف رکھ کر بحیثیت ایک قوم کے حملہ آوروں کے مقابلے پر ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

کاجی چک اپنے کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ مغلوں کا مقابلہ کرنے کیلئے میدان میں آیا۔ حکمت عملی اس طرح ترتیب دی گئی کہ مغلوں کو ''اتھ واجن'' گاؤں پہنچنے تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ کشمیر میں انہیں کسی خاص مقابلہ کا سامنا ہو گا۔ اتھ واجن کے مقام پر فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کشمیریوں کی ساری آبادی مغلوں کے خلاف میدان میں نکل آئی ہے۔ اتھ واجن میں مغلوں کو جس عبرتناک اور ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا اس کی مثال ان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ محرم بیگ اور شیخ علی ازبکی اہل کشمیر کے ساتھ صلح کے جتن کرنے لگے۔ آخر جب کشمیریوں نے بانگل کی جنگ کا پورا پورا بدلہ لے لیا تو انہوں نے مغلوں کے ساتھ صلح پر آمادگی ظاہر کی۔ خانقاہ معلّی میں ایک عہد نامہ لکھا گیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مغلوں کو کشمیر سے اُلٹے پاؤں واپس جانا پڑا۔ واپسی کے وقت مغل سرداروں کی خفت اور شرمندگی کم کرنے کی خاطر کامران مرزا کیلئے چند تحائف ارسال کیے گئے۔ دولت چک اور جہانگیر ماگرے مغل افواج کو ملکی سرحدوں سے باہر دھکیلنے کیلئے پکھلی تک اُن کے ساتھ گئے۔

(منشی محمد فوق، مکمل تاریخ کشمیر، ص 409)

اُدھر مغل افواج کشمیر سے روانہ ہوئیں اِدھر اندرون ملک امیروں اور وزیروں میں پھر سے ٹھن گئی۔ ایام جنگ میں جو اتفاق تھا وہ پارہ پارہ ہو گیا اور کشمیر کو تقسیم کر کے سابقہ چار حصوں کی بجائے پانچ حصے کیے گئے۔ پانچواں حصہ کاجی چک کو ملا۔ حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ عوام کی طرف نہ بادشاہ کی کوئی توجہ تھی نہ اس کے نوابوں کی۔ ہر طرف گروہ بندی کا زور و شور تھا۔ بادشاہ نوابوں کے ہاتھوں ایک کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ حسب منشا نچاتے رہتے تھے۔

شمالی جانب سے مغلوں کا چوتھا حملہ:

کامران مرزا مغلوں کی شکست فاش پر پیچ و تاب کھانے لگا لیکن اس وقت مغل افواج دوبارہ کشمیر پر حملہ کرنے کے قابل نہ تھیں۔ چنانچہ قیاس یہ ہے کہ مرزا کامران اور مغل شہنشاہ بابر نے اپنے رشتہ دار امیر کاشغر سلطان محمد سعید خان کو کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔

امیر کاشغر تبت کی تسخیر میں مصروف تھا اور اس نے اپنے بیٹے سکندر خان اور پوتے مرزا حیدر کو چودہ ہزار پیدل اور سات ہزار شاہسوار فوج کے ساتھ کشمیر پر یلغار کرنے کیلئے روانہ کیا۔ یہ وہ

وقت تھا جب کشمیر میں محمد شاہ شاہمیری کو پانچویں مرتبہ کشمیر کا بادشاہ بنایا گیا تھا۔ اس بار اس کی حکمرانی سات سال (1529ء سے 1536ء) تک جاری رہی۔

اہل کشمیر میں مرزا حیدر کا مقابلہ کرنے کی طاقت تھی لیکن انہیں منظم کون کرتا۔ علاقہ وار ناظم ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے جوں ہی سنا کہ لار کی طرف سے کوئی بلائے بے درماں بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے کپڑے جھاڑے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگنے میں ان امیروں نے بڑے اتفاق کا ثبوت دیا اور قلعہ ہانجک میں ایک جگہ اکٹھے ہو گئے عوام نے اپنی طرف سے حملہ آوروں کا سخت مقابلہ کیا لیکن بے ربط افواج تعداد میں کتنی ہی کیوں نہ ہوں آخر کار شکست اٹھاتی ہیں اور ان کے حملے کارگر ثابت نہیں ہوتے۔ کاشغری افواج سرزمین کشمیر کو پامال کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئیں۔

سری نگر پر قبضہ کرنے کے بعد کاشغری افواج علاقہ مراز کی طرف بڑھنے لگیں۔ صحرائے بابل نامی ایک مقام پر منتشر کشمیری افواج کا کاشغریوں سے پھر مقابلہ ہوا لیکن کشمیری رہنماؤں کی ابن الوقتی نے عام لوگوں کو حواس باختہ کر رکھا تھا وہ جم کر مقابلہ کہاں کر سکتے تھے۔ سولہ سو سپاہیوں کی ہلاکت کے بعد مقامی فوج پسپائی پر مجبور ہو گئی۔ کاشغری فوج نے تعاقب جاری رکھا۔ حتیٰ کہ فرار کے دوران انہوں نے سینکڑوں کشمیریوں کو دریائے لدر میں غرقاب کر دیا۔ کاشغری افواج چھ مہینے تک کشمیر کو تاخت و تاراج کرتی رہیں۔ لیکن دکھاوے کیلئے انہوں نے محمد شاہ کو تخت پر بٹھائے رکھا۔ اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ مغل فوجیں ابھی تک کشمیریوں میں صرف دہشت بٹھانا چاہتی تھیں اور فی الحال ان کا حکومت کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

اہل کشمیر ایک بار پھر کاجی چک کے گرد جمع ہو گئے انہوں نے اس بار غاصبوں کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا اس لحاظ سے کشمیری حریت پسندوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آج سے ساڑھے چار سو سال پہلے انہوں نے غیر ملکی غاصبوں کے خلاف گوریلا طرز کی جدوجہد کا طریقہ اپنایا۔ کشمیری جانباز جنگلوں سے چھپ چھپ کر حملے کرتے رہے۔ کاشغری افواج چھ ماہ بعد صلح کرنے پر مجبور ہو گئیں اور وہ لوٹ کھسوٹ کا سامان اکٹھا کر کے کشمیر سے رخصت ہو گئیں۔

کشمیر پر مغلوں کا پانچواں حملہ:

1540 میں سلطان اسماعیل شاہ کے بیٹے ابراہیم شاہ کے حصے میں کشمیر کی حکمرانی آئی بدقسمتی سے وہ صرف چار ماہ اقتدار میں رہا۔

کاروبارِ مملکت کاجی چک سرانجام دیتا تھا۔ کشمیر کے دو امراء ابدال ماگرے اور ریگی چک فریاد لے کر مغل شہنشاہ ہمایوں کے پاس دہلی پہنچ گئے۔ ہمایوں اس وقت شیر شاہ سُوری سے اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا لیکن پھر بھی اس نے مرزا حیدر کو کشمیر پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ مرزا حیدر لاہور سے کشمیر کیلئے روانہ ہوا اس کے ساتھ خواجہ حاجی باندے بھی تھا جس کا مغلوں سے پہلے ہی کوئی گٹھ جوڑ تھا۔

مرزا حیدر 20 رجب 947 ہجری کو کشمیر میں داخل ہوا۔ کاجی چک کشمیر کے حالات دیکھ کر شیر شاہ سوری سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ شیر شاہ مغلوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ اس لئے وہ صرف پانچ ہزار سپاہ بھیج سکا۔ کاجی چک یہ دستہ لے کر مرزا حیدر کو کشمیر سے نکالنے کیلئے روانہ ہوا۔ دونوں کے درمیان واہ طور کے مقام پر مقابلہ ہوا کاجی چک کو شکست ہوگئی اور مرزا حیدر نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ کاجی چک نے اس کے بعد بھی مغلوں کے خلاف مختلف مقامات پر کارروائیاں جاری رکھیں آخر تھنہ کے مقام پر کشمیر کا یہ عظیم مجاہد ملیریا میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔

مرزا حیدر کے دور میں کشمیر میں فرقہ پرستی نے بہت زور پکڑا۔ شیعہ سنی فرقہ وارانہ منافرت کی ایسی آگ بھڑکی جس نے صدیوں تک معاشرے کو مسموم کئے رکھا۔ مرزا حیدر نے سکردو سے شیعہ عالم میر شمس الدین عراقی کے بیٹے میر دانیال کو گرفتار کر کے سال بھر جیل میں رکھا پھر اسے قتل کروا دیا۔ اس قتل نے کشمیر کی آنے والی تاریخ پر بہت سنگین اثرات چھوڑے۔

حیدر مرزا کا انجام

کشمیر میں حیدر مرزا کے دس سال اسی طرح فتنہ وفساد کی نذر ہو گئے۔ آخر کار اس کے پاس صرف آٹھ سو رسالہ فوج بچی۔ جسے کشمیریوں نے "واہ طور" کے مقام پر حملہ کر کے ختم کر دیا۔ اس جنگ میں حیدر مرزا بھی مارا گیا۔ اس نے کشمیری عوام کے ساتھ اتنی زیادتیاں کی تھیں اور اس کے

خلاف کشمیریوں میں اس قدر نفرت تھی کہ اسے مرنے کے بعد دفن ہونے کیلئے کوئی جگہ نہ ملی۔ آخر مرنے کے پانچ روز بعد سید محمد بیہقی کی سفارش سے اسے تدفین نصیب ہوئی۔ اس کے رشتہ داروں کو کاشغر روانہ کر دیا گیا۔

مغلوں کا کشمیر پر چھٹا حملہ:

1554ء (961 ہجری) میں کشمیر میں شاہمیری خاندان کے دو سو سالہ اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور کشمیر کا چک خاندان برسرِ اقتدار آ گیا۔ چک خاندان کو گرانے کیلئے ایک کشمیری لیڈر عبدی رینہ کا بیٹا شمس رینہ دلی کی طرف دوڑ پڑا۔ ان ہی دنوں شہنشاہ ہمایوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماتمی ماحول ہونے کے باوجود مغل دربار نے مرزا ابوالمعالی کو مغل افواج کے ساتھ کشمیر کو تسخیر کرنے کیلئے بھیجا۔ ہانزہ ویر (Hanzaweer) کے مقام پر مغل اور کشمیری افواج کا مقابلہ ہوا۔ دونوں طرف سے چار ہزار سپاہی مارے گئے۔ کشمیریوں نے سترہ سو جنگی قیدی پکڑے۔ جن میں شمس رینہ بھی تھا اسے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ مغلوں کو شکست فاش ہوئی جس کی یاد عرصہ تک ان کے حلق میں پھانس بنی رہی۔

مغلوں کا ساتواں حملہ:

کشمیریوں کو خبر ملی کہ مغل کشمیر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ وہ ایک بار پھر غازی چک کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ہر مغل یلغار کیلئے خود کشمیری لیڈر دہلی والوں کو بلا کر لاتے رہے ہیں۔ لیکن جوں ہی مغل افواج کشمیر میں داخل ہو جاتی تھیں یہاں کے بیشتر رہنما اپنے اختلافات اور لڑائیاں ایک طرف رکھ کر مقابلہ کے لئے متحد ہو جاتے تھے۔ بہرام گلہ نامی مقام پر جنگ ہوئی جس میں حسب معمول مغلوں کو زبردست شکست ہوئی۔ غازی خان ایک بار پھر پہلے کی طرح قومی رہنما اور ہیرو بن گئے۔ تھوڑا ہی عرصہ گزر جانے کے بعد ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ جس کے نتیجے میں ان کا بھائی حسین خان چک تخت پر بیٹھا۔

بات یہ ہے کہ غازی خان نے اپنے باپ کی روایت کو قائم رکھا۔ نوجوانی میں نوشہرہ کے مقام پر مغلوں کو اسی قسم کی شکست سے ہم کنار کیا تھا جیسا کہ بادشاہ بننے کے بعد بہرام گلہ میں ان کو شکست سے دوچار کر دیا۔

ہمارے مؤرخ ان دونوں باپ بیٹوں کو مغلوں کو بار بار شکست دینے کا وہ کریڈٹ نہیں دیتے جس کے وہ حقدار ہیں۔

مغلوں کا آٹھواں حملہ:

ایک روز والئی کشور کشمیر یوسف شاہ کے پاس اچانک مغل شہنشاہ اکبر کا ایک شاہی فرمان پہنچا جس میں تحریر تھا کہ "ہمارے پاس بہت عرصہ سے آپ کی مملکت سے کوئی خبر نہیں پہنچی۔ آپ شہنشاہ کی بارگاہ میں اس کیلئے حاضر ہو جائیں۔" یوسف شاہ نے اپنے وزیروں اور امیروں کا اجلاس طلب کیا اور مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ درباریوں کی متفقہ رائے اور وزیر اعظم مرزا قاسم کے مشورہ سے شہزادہ یعقوب خان کو تحائف دے کر دربار میں بھیج دیا گیا۔ ان تحائف میں چالیس شالیں، ایک سو تیز رفتار گھوڑے اور زعفران شامل تھا۔

مغل شہنشاہ کو یہ بات کچھ پسند نہ آئی اور شہزادہ یعقوب کا خاص استقبال نہیں کیا گیا۔ شہزادہ یعقوب نے یہ ساری صورت حال لکھ کر اپنے والد کو بھیج دی۔ اکبر بادشاہ کابل جانے کی تیاریوں میں تھا۔ اس نے شہزادہ یعقوب کو اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ لدھیانہ پہنچ کر اس نے حکیم علی اور صالح عاقل نامی دو اشخاص کو یہ حکم دے کر کشمیر روانہ کیا کہ یوسف شاہ (والئی کشمیر) کو اصالتاً لاہور حاضر کریں۔

یعقوب خان نے اکبر کے یہ تیور دیکھے تو وہ ان قاصدوں سے اجازت لئے بغیر کشمیر روانہ ہو گیا اور اپنے والد کو اکبر اعظم کے ارادوں سے آگاہ کیا۔ شہزادہ یعقوب کے اس طرح چلے جانے سے اکبر آگ بگولہ ہو گیا۔ سری نگر سے قاصدوں نے یہ اطلاع دی کہ یوسف شاہ اکبر کے شاہی دربار میں حاضر ہونے سے ٹال مٹول کر رہا ہے۔ اکبر نے راجہ بھگوان داس کو 40 ہزار فوج کے ساتھ کشمیر پر حملے کا حکم دیا۔

یوسف شاہ نے مقابلہ کی تیاریاں کیں اور خود 12 ہزار شاہسوار اور 30 ہزار پیادہ فوج لے کر "اوڑی" کے قریب کوارمست کے مقام پر پہنچا۔ پہاڑی راستوں پر فوجی دستے مقرر کئے گئے۔ "بولیاس" کے مقام پر کشمیریوں نے مغل فوج کے دستے کو شکست دی۔ ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی جس کی وجہ سے مغل افواج کا شیرازہ بکھر گیا۔

راجہ بھگوان داس نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی۔ اس نے یوسف شاہ کے پاس قاصدوں کے ذریعے پیغام بھجوائے کہ اگر اس بار مغلوں کو شکست ہوئی تو کیا ہوا۔ اگلی بار اکبر اعظم ایک لاکھ سپاہ کے ساتھ حملہ آور ہوگا۔ ان کے پاؤں کشمیر کی سرزمین کو روند ڈالیں گے۔

دوسری طرف وہ یوسف شاہ سے عاجزی کرنے لگا کہ آپ ایک بار شہنشاہ اکبر سے ملاقات کیلئے تشریف لائیں تو ہم نہ آپ کے ملک پر قبضہ کریں گے۔ نہ آپ کا تاج وتخت آپ سے چھینا جائے گا۔

یوسف شاہ اپنے فوجی کمانڈروں، وزیروں اور رشتہ داروں سے پوچھے بغیر بھگوان داس کی تجویز پر اکبر سے ملاقات کو چل پڑا۔ اکبر کے دربار میں پہنچتے ہی اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا کر اسے لاہور کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ (ایک اطلاع کے مطابق یوسف شاہ کو روہتاس کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔) بھگوان داس نے یوسف شاہ کو جان اور حکمرانی کے تحفظ کا یقین دلایا تھا۔ یہ عہد شکنی دیکھ کر اس غیرت مند راجپوت نے خودکشی کرلی۔

بعد میں راجہ مان سنگھ (بھگوان داس کے بیٹے) نے اپنے بہنوئی شہنشاہ اکبر سے سفارش کر کے یوسف شاہ کو قید سے رہائی دلوائی۔ اور صوبہ بہار میں ایک جاگیر دلوائی جہاں یوسف شاہ نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام گزارے۔ آخری ایام میں اسے دماغ کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔

ساڑھے تین سو سال بعد ضلع پٹنہ (بہار) کے ایک گاؤں بسواک میں کشمیر کے آخری تاجدار کی قبر دریافت ہوئی۔ جس پر حکومت جموں وکشمیر نے مقبرہ بنوایا۔

مغل تسلط کے ابتدائی تین سال

مغلوں کو ابتدائی تین سال (1586ء سے 1589ء تک) کشمیر پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں لگ گئے۔ انہوں نے ہر نوع کے اسلحہ جات پر پابندی لگا دی جن میں باورچی خانہ میں استعمال ہونے والی بڑے سائز کی چھریاں اور چاقو بھی شامل تھے۔ انہوں نے ہر گھر کی تلاشی لی۔ خاص طور پر تہہ خانوں (Basements) میں مکمل تلاشی لی گئی۔ جہاں ان کا خیال تھا کہ انہیں اسلحہ ملے گا۔ 1589ء کے اختتام تک کشمیر کے میدانوں میں کسی فرد واحد کے پاس کوئی اسلحہ نہیں بچا۔ مغل

حکمران کشمیری عوام کی شاہراہِ آزادی کو مسدود کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے خلاف کشمیر کے طول و عرض میں جگہ جگہ بغاوتیں ہوتی رہیں۔

(پرویز دیوان۔ روزنامہ ڈان۔ 8 فروری 2004ء)

(The DAWN books & authors p2,3 8 Feb, 2004 Jammu Kashmir Ladadakh by Pervez Diwan)

نوٹ: پرویز دیوان بھارتی کشمیر کے رہنے والے ہیں اور بھارتی حکومت میں وہ ایک جانے پہچانے قلم کار ہیں۔ درج بالا تحریر ان کے ایک مضمون میں سے لی گئی ہے۔ جو "جموں کشمیر، لداخ" کے عنوان سے 8 فروری 2004ء کو روزنامہ ڈان کراچی میں شائع ہوا تھا۔

(ب) افغانوں کا دورِ استبداد

(1753ء سے 1819ء تک۔ 66 سال)

پڑوسی ملک افغانستان میں 1747ء میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ کو ایک سازش کے تحت رات کو قتل کر دیا گیا۔

احمد شاہ ابدالی جو نادر شاہ کا مصاحب تھا۔ اس نے قبیلہ سدوزئی کے چار پانچ ہزار آدمی اکٹھے کر کے پہلے نادر شاہ کے قاتلوں کی خبر لی۔ پھر اس کے بعد ملک کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور سلطنت پر قابض ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد احمد شاہ ابدالی لاہور میں مقیم تھا کہ دو کشمیری عمائدین (میر مقیم اور خواجہ ظہیر) نے اس سے ملاقات کر کے کشمیر میں مغلوں کا اقتدار ختم کرنے کی دعوت دی۔ ابدالی نے دعوت قبول کر لی اور عبداللہ خان ایشک اقاصی کو ایک لشکر دے کر کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ 1753ء میں افغان دستے کشمیر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح کشمیری عوام مغلوں کی غلامی سے نکل کر افغانوں کے پنجۂ استبداد میں آ گئے۔ افغانوں کی حکمرانی 1753ء سے 1819ء تک کل 66 سال جاری رہی۔ اس 66 سال کے عرصے میں یہاں یکے بعد دیگرے 24 صوبیدار مقرر ہوئے۔ ایک دو کو چھوڑ کے ان تمام صوبیداروں نے ظلم و تشدد اور استحصال کی کارروائیاں جاری رکھیں۔ عبداللہ خان ایشک اقاصی کے بارے میں مورخ محمد دین فوق لکھتے ہیں:

> "شاہی خزانے اور دفینے تو عبداللہ خان کیلئے شیر مادر ہی تھے اس نے تمام رعایا میں لوٹ مار مچا دی۔ تمام ملک میں شور و واویلا پیدا ہو گیا۔"

(مکمل تاریخ کشمیر، ص 629)

جگ موہن لکھتے ہیں:

"ایشک اقاصی نے تاجروں سے ایک کروڑ روپیہ زبردستی حاصل کیا۔ وہ صاحب حیثیت کشمیریوں کو قطار میں کھڑے کر کے مطالبہ کرتا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے دے دو ورنہ مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔"

1771ء میں امیر خان جواں شیر کشمیر کا صوبیدار مقرر ہوا۔ وہ نہایت عیاش آدمی تھا۔ اس نے ملاحوں کی ایک حسین لڑکی سے شادی کر لی۔ جواں شیر کے ملاح رشتہ داروں نے اس رشتے سے فائدہ اٹھایا اور تمام پرانی عمارتوں اور باغوں کو ویران کر دیا۔ اور ان عمارتوں کا میٹریل (پتھر، اینٹیں وغیرہ) اکھاڑ کر ان سے اپنے مکان تعمیر کیے۔ جگ موہن لکھتے ہیں:

"امیر خان کے سسرالی رشتہ داروں (ہانجیوں) نے 700 کے قریب مغل باغات اور عمارتوں کو مسمار کیا اور ان میں استعمال ہونے والا سامان (پتھر، اینٹیں وغیرہ) اپنے مکانات کی تعمیر کے کام میں لائے۔"

ایک اور گورنر کریم خان نے ساری پیداوار کابل برآمد کرنے کا قانون بنایا۔ زمینداروں نے اپنے سیب کے باغات کاٹ دیئے اور چاول کاشت کرنا بند کر دیا۔ افغان دور حکومت میں کشمیر سے خوبصورت لڑکیاں جبراً اغوا کر لی جاتی تھیں اور انہیں کابل کے بازاروں میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔

پنڈتوں اور شیعوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک:

پنڈتوں کو کشمیر میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ان کے علم وفضل کی بنا پر انہیں افغان دربار میں جگہ مل گئی لیکن انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ داڑھی رکھیں۔ جوتے نہ پہنیں اور پگڑی نہ باندھیں۔ انہیں ماتھے پر تلک لگانے کی ممانعت کر دی گئی۔

پنڈتوں سے گھاس کے بڑے بڑے بورے بنوائے جاتے تھے۔ پھر دو دو پنڈتوں کو آمنے سامنے سے باندھ کر بوریوں میں بند کرایا جاتا تھا اس کے بعد کشتی میں رکھ کر جھیل ڈل میں زندہ

ڈبو دیا جاتا تھا۔ جھیل کا وہ حصہ جہاں ان پنڈتوں کو ڈبو دیا جاتا تھا بٹہ مزار (ہندوؤں کا قبرستان) کہلاتا ہے۔

بلند خان بامزئی گورنر کے دور میں شیعہ سنی فساد برپا ہوا۔ اہل تشیع کی بستی زڈی بل کو نذر آتش کر دیا گیا۔

آزاد خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد چن چن کر لوگوں کی بیٹیوں کی عصمت لوٹی۔ اس کام کیلئے اس نے دلال رکھے ہوئے تھے جو اس کے لیے خوبصورت لڑکیاں لایا کرتے تھے۔

مورخ محمد دین فوق افغان دور حکمرانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یوں تو تمام عہد افغانیاں کشمیر کیلئے تازیانہ عبرت تھا لیکن حاجی کریم داد خان اور آزاد خان دونوں باپ بیٹوں کا زمانہ کشمیر میں قہر الٰہی سے کم نہ تھا۔ رعایا فاقوں سے تباہ حال ہو رہی تھی اور یہ باپ بیٹا نئے نئے محصولات سے ان کا کچومر نکال رہے تھے۔"

1785ء میں سیف الدولہ مدد خان اسحٰق زئی نے کشمیر کی نظامت (گورنری) کا عہدہ سنبھالا۔ عوام الناس نے اسے آزاد خان اور مدد خان کا تسلسل سمجھا۔ ایک شاعر نے اسے یوں نظم کیا۔

ظلم آزاد را رسید مدد

یعنی آزاد خان کے مظالم کیلئے مدد خان آ گیا۔

1793ء میں چند ماہ کیلئے میر ہزار خان نے کشمیر کے صوبیدار (گورنر) کا منصب سنبھالا۔ اس نے کابل کے بادشاہوں کے احکام بجالانے کی بجائے خودمختاری کا اعلان کر دیا اور عوام پر طرح طرح کے ستم ڈھانے لگا۔ ہندوؤں اور شیعوں پر اس نے قیامت برپا کر دی۔ ہزاروں بے گناہ پنڈتوں کو اس نے قتل کر کے جھیل ڈل میں ڈبو دیا۔ تمام ہندوؤں پر جزیہ عاید کر دیا۔ ہندوؤں کو فارسی پڑھانے کی ممانعت کر دی۔

1794ء میں کفایت خان کو کشمیر کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس کے دور حکومت میں ایک بار پھر شیعہ

سی فساد پھیل گیا۔ جس نے ملک کا نظم ونسق تباہ کر دیا۔

1796ء میں عبداللہ خان الکوزئی کو کشمیر کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس نے اس عہدہ پر پانچ سال گزارے۔ عبداللہ خان رفاہ عامہ کیلئے کوشش کرتا رہا اور عوام کیلئے عدل وانصاف کے دروازے کھول دیئے۔

1807ء میں عطا محمد خان کشمیر کا گورنر بنا۔ وہ درویش صفت انسان تھا۔ اس نے کشمیر کے تمام فرقوں سے مساویانہ سلوک قائم کیا۔

محمد عظیم خان نے شاہ افغانستان کے حکم پر کشمیر میں آخری صوبیدار کے حیثیت سے 1813ء سے 1819ء تک چھ سال گورنری کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے دور میں 1814ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر فوج کشی کی۔ اچانک بارش شروع ہو جانے کی وجہ سے سردی اتنی بڑھی کہ گرم ملک (پنجاب) کے رہنے والے الامان پکار اٹھے۔ اگلے روز مقابلہ ہوا جس میں تین ہزار سکھ فوجی کام آئے۔ اس کے بعد انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

بعد میں رنجیت سنگھ نے دوبارہ کشمیر پر حملہ کیا جس میں اسے کامیابی ہوئی اور کشمیر افغانوں کے قبضہ سے نکل کر سکھوں کے چنگل میں آ گیا۔

(ج) رنجیت سنگھ کی سکھا شاہی

(1819ء سے 1846ء تک۔ 27 سال)

1819ء میں کشمیر پر افغان حکمرانی کے زوال کے بعد پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی غلامی کا دور شروع ہو گیا۔ جو 27 سال تک جاری رہا۔ یہ 27 سالہ دور اہل کشمیر کیلئے ظلم وجبر کا بدترین دور تصور کیا جاتا ہے۔ مورخ کشمیر محمد دین فوق اپنی تصنیف ''مکمل تاریخ کشمیر'' میں غلامی کے اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''افغان حکومت اگر تلخ گھونٹ کے مشابہ تھی تو خالصہ بہادر زہر میں بجھے ہوئے تیر نکلے۔''

افغانوں کے دور حکومت میں اگر ظلم وستم میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو اسے سکھوں نے تکمیل تک پہنچایا۔ خاص طور پر سردار ہری سنگھ نلوہ اور جمعدار خوشحال سنگھ نے ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ ہندو یا مسلمان جس کسی کشمیری کے پاس دولت کی خبر ملی، چھین لی گئی۔

اس دور کے حالات کو مختلف تاریخ دانوں نے تفصیل سے اپنی تصنیفات میں قلم بند کیا۔ خواجہ محمد یوسف صراف (سابق چیف جسٹس) نے اس موضوع پر اپنی تصنیف ''کشمیریز فائٹ فار فریڈم'' (Kashmiri's Fight for Freedom) میں نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ مورخ محمد دین فوق نے اپنی تاریخ کا حصہ سوئم صرف اسی دور کے حالات کیلئے مختص کر دیا۔ سکھوں کے 27 سالہ دور حکمرانی میں مختلف افراد کو گورنر بنا کر کشمیر بھیجا گیا۔ اور ان کے ذریعے عوام پر ظلم وستم اور استحصال کا سلسلہ جاری رہا۔

مصر دیوان چند کو 1819ء میں کشمیر کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا۔ وہ کشمیر میں صرف چند ماہ تک گورنر کے عہدہ پر رہا لیکن اپنے مختصر عرصہ میں بھی اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو 25 لاکھ روپے نقد اور لاکھوں کے تحائف پیش کیے

دیوان موتی رام کو 1819ء کے اواخر میں کشمیر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ وہ ایک سال دو ماہ کشمیر کا گورنر رہا۔ اس کے دور میں کشمیر کی زیادہ تر مسجدوں کے دروازوں پر تالے ڈال دیئے گئے۔ جن میں سری نگر کی جامع مسجد بھی شامل تھی۔ 1820ء میں کشمیر میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی جس کے نتیجہ میں بے شمار لوگ ہلاک ہو گئے۔ اسی سال کشمیر میں قحط پڑ گیا۔ ہیضہ، قحط اور حکمرانوں کے ظلم سے تنگ آ کر ہزاروں لوگ ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔

ہری سنگھ نلوہ: کشمیر پر حملہ کے وقت خالصہ افواج ہری سنگھ کے زیر کمان تھیں۔ ہزارہ کی حکمرانی بھی اسے سونپ دی گئی۔ ہری پور ہزارہ اسی کا آباد کیا ہوا شہر ہے۔ ہری سنگھ سخت جابر اور سخت گیر حاکم تھا۔ اس نے کشمیر میں اپنے نام کی کرنسی جاری کی۔ سکھوں کے دور حکومت میں کشمیری عوام بغاوت کرتے رہے۔ ہری سنگھ نلوہ کے دور میں بھی بارہ مولہ، مظفر آباد، پونچھ اور راجوری کے علاقوں میں شورش بلند ہوتی رہی جسے نلوہ نے سختی سے دبا دیا۔

دیوان موتی رام اور دیوان چونی لال: 1822ء میں ہری سنگھ نلوہ کو کشمیر کی گورنری سے ہٹا کر ہزارہ کا ناظم بنا دیا گیا اور اس کی جگہ دیوان موتی رام کو کشمیر کا گورنر بنا دیا گیا۔ دو سال بعد موتی رام کی جگہ دیوان چونی لال کو گورنر لگا دیا گیا۔ اس کے دور کا اہم تاریخی واقعہ یہ ہے کہ گاؤ کشی (گائے ذبح کرنے) کے جرم میں دو مسلمانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جو آپس میں سسر داماد کا رشتہ رکھتے تھے۔ ان دونوں کو قتل کی سزا دے کر ان کی لاشوں کی سارے شہر میں تشہیر کی گئی۔

دیوان کرپا رام: چونی لال کے بعد دیوان کرپا رام کو 1827ء میں گورنر لگا دیا گیا۔ کرپا رام کو کشتی رانی کا بہت شوق تھا۔ وہ ملاحوں کی نوجوان لڑکیوں کی کلائیوں میں گھنگھرو باندھ دیا کرتا تھا اور زرق برق لباس پہنایا کرتا تھا۔ جب وہ کشتی کے چپو چلانے لگتیں تو گھنگھروؤں سے شرویئں شرویئں کی آواز آتی۔ چنانچہ کشمیری زبان میں اس کا نام "کرپا شرویئں" پڑ گیا تھا۔

1827ء میں کشمیر میں زبردست زلزلہ آیا جس سے سینکڑوں مکان گر گئے اور ہزاروں لوگوں

کی جانیں تلف ہو گئیں۔ اسی دور میں والئی مظفر آباد، سلطان زبردست خان کی قیادت میں کشمیری عوام نے حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔

1829 میں لاہور دربار سے حکم آیا کہ اپنے منشی کو حساب کتاب کے ساتھ بھیجو۔ کرپا رام نے حکم کی تعمیل کی اور حساب کتاب کے علاوہ ایک لاکھ چالیس ہزار روپے (1,40,000) کا پشمینہ بھیجا۔ کشمیر سے اس دوران ماہانہ دو لاکھ روپے بطور مالیہ لاہور دربار کو بھیجے جاتے تھے۔

1831ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کرپا رام سے ناراض ہو گیا اور اسے معزول کر کے اس کی ساری جائیداد ضبط کر لی۔ اس کی جائیداد لاکھوں کی مالیت کی تھی۔ کرپا رام کو قید میں ڈال دیا گیا۔ جہاں سے اس نے 9 لاکھ روپے دے کر رہائی حاصل کی۔

بھمان سنگھ اردلی: دیوان کرپا رام کے بعد بھمان سنگھ اردلی کو گورنر کشمیر لگا دیا گیا۔ بھمان سنگھ نے اپنی ملازمت کا آغاز ایک معمولی عہدہ اردلی سے کیا تھا اور رفتہ رفتہ گورنر کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ بھمان سنگھ کے دور میں 1831ء میں سری نگر میں شیعہ سنی فساد برپا ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت تباہی ہوئی۔ شیعہ فرقہ کے لوگوں کو لوٹا گیا۔ ان کی آبادی زڈی بل اور حسن آباد کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا گیا۔ بھمان سنگھ کی حکومت نے فساد اور تباہی کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

کنور شیر سنگھ: بھمان سنگھ اردلی کی معزولی کے بعد دسمبر 1832ء میں کنور شیر سنگھ کو گورنر کشمیر مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنے دور کا آغاز ظلم سے کیا۔ بارہ مولہ پہنچ کر اس نے دریا کے راستے سے سری نگر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ ہزاروں ملاحوں اور زمینداروں کو بیگار میں پکڑا گیا کہ وہ یخ بستہ دریا کی برف کاٹ کر کشتی کیلئے راستہ بنائیں۔ چنانچہ سری نگر تک کا 33 میل کا راستہ تین دن میں طے ہوا۔ اس نے کاروبار حکومت بسا کھا سنگھ کے حوالے کیا جس نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا اور رعایا سے زیادہ سے زیادہ مالیہ وصول کرنے کیلئے ظالمانہ حربے استعمال کیے۔

اسی دور میں استور کے علاقے میں قیمتی پتھر کی ایک کان دریافت ہوئی جہاں سے قیمتی پتھر نکال کر کنور شیر سنگھ لاہور دربار میں بھیجتا رہا۔ اسی دور میں بسا کھا سنگھ کو واپس بلا کر جمعدار خوشحال سنگھ کو مالیات کی وصول کیلئے کشمیر بھیجا گیا۔ خوشحال سنگھ 17 سال کی عمر میں 1807ء میں روزگار کی تلاش میں لاہور آیا تھا۔ لڑکا بہت ہوشیار اور خوش اندام تھا۔ رنجیت سنگھ بہت حسن پرست واقع ہوا

تھا۔ عورتوں اور خوبصورت لڑکوں سے بھی شغف رکھتا تھا۔ خوشحال سنگھ بھی رنجیت سنگھ کی نظروں میں سما گیا۔ بحیثیت اردلی ملازم ہوا اور ترقی کرتے کرتے جمعدار کے عہدے تک جا پہنچا۔

خوشحال سنگھ صرف تین ماہ کشمیر میں رہا۔ صرف ان تین مہینوں میں اس نے تباہی مچا دی۔ تین ماہ کے اندر اس نے سوا چودہ لاکھ روپے نقد اور جنس میں وصول کر کے لاہور دربار میں بھیجے۔

جنرل میہاں سنگھ کمیدان: میہاں سنگھ 1834ء میں کشمیر کا گورنر مقرر ہوا اور 1841ء تک (7 سال) اس عہدے پر قائم رہا۔ یہ واحد گورنر ہے جس نے کشمیری عوام کے ساتھ انسانوں کا سلوک کیا۔ اس نے سابقہ دور کی بربریت کا بڑی حد تک تدارک کیا۔ کئی ٹیکس معاف کئے اور خلق خدا سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اس نے غلہ ذخیرہ کرنے والے غلہ داروں کے خلاف سخت کارروائی کی۔

اگرچہ جنرل میہاں سنگھ کا دورِ اقتدار کشمیریوں کیلئے نسبتاً کم مصیبتوں کا دور تھا۔ تاہم لاہور دربار کی جانب سے آئے دن مالیہ کی وصولی اور فرمائشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان فرمائشوں کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سکھوں کی بادشاہت کو زوال آ گیا۔ خاندان کے اندر قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شیخ غلام محی الدین 1841ء سے 1845ء تک کشمیر کا گورنر رہا۔ اس نے مہاراجہ شیر سنگھ سے اجازت لے کر بادشاہی مسجد کے دروازے 24 سال کے بعد مسلمانوں پر کھول دیئے۔ تاہم عوام پر ظلم و ستم کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ شیخ غلام محی الدین کی وفات کے بعد 1846ء میں اس کا بیٹا شیخ امام الدین چھ ماہ کیلئے کشمیر کا گورنر رہا۔ یہ دونوں باپ بیٹے انتہائی کمزور کردار کے حامل تھے۔ سکھ نظام میں وہ کسی قسم کی تبدیلی لانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے تھے۔

19ویں صدی کے وسط میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان پنجاب میں جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا۔ جس میں اکثر سکھوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ فریقین کے درمیان ایک موقع پر صلح کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ انگریزوں نے صلح کی شرائط میں 1.5 کروڑ تاوان جنگ ادا کرنے کی شرط بھی لگائی۔ 9 مارچ 1846ء کو سرکار انگلشیہ اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے سکھوں نے 1.5 کروڑ تاوان جنگ ادا کرنے کی شرط منظور کی۔ جس میں سے

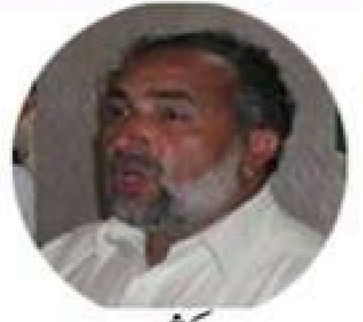
50 لاکھ روپے نقد ادا کئے گئے جبکہ ایک کروڑ کے بدلے کشمیر کی ریاست اور ہزارہ کا علاقہ سرکار انگلشیہ کو تفویض کر دیا گیا۔ انگریزوں کو نقد رقم کی بہت ضرورت تھی سو انہوں نے 16 مارچ 1846ء کو بمقام امرتسر گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ساتھ ایک معاہدہ عمل میں لایا۔ جو معاہدہ امرتسر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے کشمیر اور ہزارہ پر حکمرانی کے اختیارات مہاراجہ گلاب سنگھ کو دلائے گئے اور اس نے 75 لاکھ روپے نقد انگریز سرکار کے کو ادا کر دیئے۔

1586ء سے 1846ء تک دو سو ساٹھ سال تک کشمیر یکے بعد دیگرے مغلوں، افغانوں اور پنجاب کے سکھوں کا غلام رہا۔ 1846ء میں غیر ملکی حکمرانی کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن جموں کے ایک ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ نے 75 لاکھ روپے میں انگریزوں سے کشمیر پر حکمرانی کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے۔

دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند







RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF

ڈوگرہ حکمرانی کا ایک سو سال

19ویں صدی کے وسط میں پنجاب میں انگریزی افواج اور سکھ افواج کے درمیان طویل عرصہ تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا جس میں کئی مرتبہ سکھوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے انگریزوں اور سکھوں دونوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ وہ ان تعلقات کی بنا پر دونوں کے درمیان صلح صفائی کی کوشش کرتا رہا۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں انگریز سرکار اور لاہور کے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے درمیان 9 مارچ 1846ء کو ایک معاہدہ عمل میں آیا۔ اس میں سکھوں نے علاوہ اور باتوں کے تاوانِ جنگ کے طور پر انگریزوں کو ڈیڑھ کروڑ روپیہ دینے کا اقرار کیا۔ اس رقم میں سے 50 لاکھ روپیہ نقد ادائیگی کی گئی جبکہ بقیہ ایک کروڑ کے عوض ملک کشمیر اور ہزارہ کا علاقہ انگریزوں کو دے دیا گیا۔ انگریزوں کو نقد رقم کی زیادہ ضرورت تھی۔ سو انہوں نے 16 مارچ 1846ء کو 75 لاکھ روپے کے عوض کشمیر اور ہزارہ پر حکمرانی اور اختیارات کے حقوق مہاراجہ گلاب سنگھ کو دے دیے۔ اس معاہدہ پر گورنر جنرل ہند سر ہنری ہارڈنگ اور مہاراجہ لاہور نے اصالتاً دستخط کیے۔

اس طرح مہاراجہ گلاب سنگھ سلطنت جموں و کشمیر و اقصائے تبت ہا و ہزارہ کی بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ہزارہ کے لوگوں میں یہ بات بہت عام تھی کہ ہزارہ قدیم زمانے سے ہی کشمیر کی مملکت میں شامل رہا ہے۔ چین کے مشہور سیاح ہیون تسانگ نے 33-631ء میں اس کی تصدیق کی ہے۔ اور مؤرخ البیرونی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ لیکن ہزارہ کے مقامی لوگوں اور جاگیرداروں اور نوابوں نے، جن میں نواب امب اور نواب دربند شامل تھے، اس بات پر ہنگامہ کر دیا اور انہوں نے انگریزوں سے صاف کہہ دیا کہ انہیں کسی قیمت پر ڈوگرہ گلاب سنگھ کا ساتھ قبول نہیں ہے۔ چنانچہ 5 جنوری 1847ء کو مہاراجہ دلیپ سنگھ (پنجاب) اور مہاراجہ گلاب سنگھ (کشمیر) کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے:

"دریائے جہلم کے مغرب میں واقع علاقہ ہائے کھوٹ، پکھلی و ہزارہ تا حدود دریائے سندھ کا تبادلہ دریائے جہلم کے مشرق میں واقع علاقہ جات کا تصرف جموں کے ساتھ عمل میں لایا گیا۔"

مہاراجہ گلاب سنگھ:

گلاب سنگھ 1788ء میں جموں میں پیدا ہوا۔ 20 سال کی عمر میں جب اس کے خاندان پر برا وقت آیا تو گلاب سنگھ میر پور کے جنوب مغرب میں منگلا نامی قلعہ کے قلعہ دار کی فوج میں تین روپے ماہانہ اور کھانا کے معاہدہ پر ملازم ہوا۔ گلاب سنگھ 1811ء میں اپنے بھائی دھیان سنگھ کے ہمراہ گھوڑے خریدنے لاہور آیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سامنے پیش ہوا۔ شائستہ اطوار اور خوبصورت ناک نقشہ دیکھ کر مہاراجہ نے انہیں 90 روپے ماہانہ پر اپنا مصاحب رکھ لیا۔ ڈاکٹر صوفی نے اپنی مشہور تاریخ "کشمیر" میں لکھا ہے۔

"دراصل یہ تینوں ڈوگرہ بھائیوں کی خوبصورتی تھی جس نے فی الفور رنجیت سنگھ کو جو ذاتی حسن کا قدردان تھا ان کی طرف متوجہ کیا۔"

گلاب سنگھ اپنے خاندان کا پہلا حکمران تھا جس نے 1846 سے 1858 تک 12 سال حکمرانی کی۔

پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں:

"مہاراجہ گلاب سنگھ ایک طاقتور اور جابر حکمران تھا اس نے امن و امان بحال کرنے کی کوشش کی مگر اس غرض کیلئے جو طریقے اختیار کیے وہ انتہائی وحشیانہ تھے۔ پونچھ میں کسی جگہ شورش برپا ہوگئی تو اسے دبانے کیلئے وہ خود موقعہ پر گیا اور اپنی آنکھوں کے سامنے کچھ زندہ قیدیوں کی کھالیں کھچوائیں۔ پھر ان میں بھوسہ بھر کر شاہراہ عام پر لٹکایا گیا۔"

یہ واقعہ 1824 میں پونچھ میں پیش آیا۔ پونچھ کے ایک عظیم مجاہد شمس خان نے رنجیت سنگھ کی

جارحیت کے خلاف بغاوت کر کے اپنی حکومت کا اعلان کیا تھا۔ رنجیت سنگھ کے حکم پر گلاب سنگھ نے آزاد پتن سے دریائے جہلم کو عبور کر کے پیش قدمی کی اور منگ کے مقام پر پہنچا۔ سردار علی خان اور سردار سبز خان سدھن دونوں سردار شمس خان ملدیال کے دوست تھے۔ یہ دونوں سکھ افواج کے خلاف بے جگری سے لڑتے رہے اور آخر میں ایک سازش کے تحت قیدی بنا لیے گئے۔ گلاب سنگھ نے اپنی آنکھوں کے سامنے منگ کے مقام پر ان کی کھالیں کھچوائیں مگر ان بہادروں نے اس اذیت کے دوران بھی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا۔

گلاب سنگھ کا انتقال 4 اگست 1858ء کو سری نگر میں ہوا۔

"ڈوگرہ راج سے پہلے کشمیر کے تمام حکمران غیر ملکی تھے۔ ڈوگرے اس ملک کے رہنے والے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ڈوگروں نے جموں کو تو اپنا وطن سمجھا لیکن کشمیر کو اپنا مفتوحہ ملک سمجھا۔ ریاست میں ایسا ڈوگرہ سامراج قائم کیا گیا جس میں ڈوگروں کو تو آقاؤں کی حیثیت دی گئی اور غیر ڈوگرہ طبقوں کو حقیر اور ادنیٰ گردانا گیا۔"

(تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر۔ پریم ناتھ بزاز۔ ص 144)

مہاراجہ رنبیر سنگھ:

گلاب سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اور ولی عہد رنبیر سنگھ تخت نشین ہوا۔ رنبیر سنگھ بہت نرم دل آدمی تھا۔ سادہ اور اخلاقی زندگی گزارتا تھا۔ لوگوں کی عرضیاں سننے اور ان کا جواب دینے کے لیے وہ روزانہ دربار عام منعقد کرتا تھا۔

وادی کشمیر میں قحط پڑتے رہے ہیں۔ 1877ء میں ایسا قحط پڑا کہ اسے یاد کر کے اب بھی لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہزاروں لوگ فاقہ کشی کا شکار ہو گئے۔ وادی کے اکثر حصے غیر آباد ہو گئے۔ ان گنت دیہات ویران ہو گئے اور حکومت اس ناگہانی آفت میں اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہی۔

رنبیر سنگھ کے دور میں محاصل کا ظالمانہ نظام جاری رہا۔ شال بافی پر کئی مرحلوں میں ٹیکس وصول کیا جاتا تھا اور ینگ ہسبنڈ کے مطابق آخر کار یہ محصول شال بافی میں قیمت کے 85 فی صد

تک پہنچ جاتا تھا۔قصابوں، ترکھانوں، کشتی بانوں تک کو ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔

تاہم ملک کو ترقی دینے کے لیے رنبیر سنگھ نے اندرونی طور پر کئی ترقیاتی کام سرانجام دیئے۔ اس نے جموں اور کشمیر کے درمیان آمدورفت کے لیے ایک سڑک تعمیر کی جو بانہال کارٹ روڈ کہلاتی ہے۔

اس نے دیوانی اور فوجداری قوانین کے مجموعے تیار کرائے جو کہ ''رنبیر پینل کوڈ'' Ranbir Penal Code کے نام سے ریاست میں متعارف ہوئے۔اس نے پولیس کا محکمہ قائم کیا، شفاخانے بنوائے، محکمہ ڈاک کا انتظام کیا۔ 1877ء میں کشمیر سے جموں اور سیالکوٹ تک بے تار برقی نظام قائم کیا۔اس نے سری نگر سے کوہالہ تک پختہ سڑک کی تعمیر کا آغاز کیا۔ جو بعد میں مکمل ہو کر جہلم ویلی روڈ (Jehlum Valley Road) کہلائی۔

رنبیر سنگھ کے دور حکمرانی کا اہم ترین کارنامہ اس کی وہ کوششیں ہیں جو اس نے جموں کشمیر کو بین الاقوامی طور پر ایک اعلیٰ مقام دلانے کیلئے کافی عرصے تک جاری رکھیں۔ 1865ء میں چار اراکین پر مشتمل ایک وفد روس سے بات چیت کے لئے تاشقند بھیجا گیا۔ انگریزی علاقوں میں کشمیریوں کے اس وفد پر نامعلوم افراد نے حملہ کر کے دو افراد کو قتل کر دیا اور زار روس کے نام مہاراجہ رنبیر سنگھ کا پیغام بھی چھین لیا۔ دو افراد عبدالرحمان اور سرفراز سکندر خان تاشقند پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے زار کے نمائندوں سے بات چیت کا آغاز کیا۔ انہوں نے روس کے گورنر جنرل چرنیئف (Gen. Cherniaef) تک والئی کشمیر کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے اپنے دورے کا مقصد بتاتے ہوئے کشمیر اور روس کے عوام میں دوستی کے رشتے قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جنرل نے عسکری یا سیاسی مدد کرنے سے انکار کیا البتہ تجارتی تعلقات قائم کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ وفد سات مہینے روس میں رہ کر جون 1866ء میں واپس آگیا۔

اکتوبر 1869ء میں رنبیر سنگھ نے ایک اور دو رکنی وفد بابا کرم پرشاد کی قیادت میں بھیجا۔ وفد نے روسی حکمرانوں کو بتایا کہ کشمیر ایک خودمختار مملکت ہے اور روس اور کشمیر کے تعلقات دونوں ممالک کے عوام کیلئے سودمند ہوں گے لیکن روسی حکمران برطانیہ کی طاقت سے خوف زدہ تھے اس لیے انہوں نے پھر معذرت کی۔ کرم پرشاد 1872ء میں جموں واپس آگئے۔

رنبیر سنگھ نے کشمیر میں روسی زبان سکھانے کے لیے ایک سکول قائم کیا تھا تاکہ وسط ایشیا میں روسیوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں زبان کی رکاوٹ کو دور کیا جائے۔

اسی طرح کی اور بھی شہادتیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رنبیر سنگھ کے دل میں روس اور وسط ایشیا کی ریاستوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے کی شدید خواہش موجود تھی۔ رنبیر سنگھ کی یہ خواہش قابل ستائش سمجھی جاتی ہے کہ اس نے کشمیر کی مملکت کو بین الاقوامی سطح پر ایک اعلیٰ اور باعزت مقام دلانا چاہا تھا۔ اس نے ایک موقعہ پر روسی حکمرانوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ کشمیر ایک خود مختار ریاست ہے اور ہم انگریزوں کے تابع فرمان نہیں ہیں۔ رنبیر سنگھ کا 28 سال کی حکمرانی کے بعد 12 ستمبر 1885ء کو انتقال ہوگیا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ:

1885ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی وفات پر اس کا سب سے بڑا بیٹا پرتاپ سنگھ تخت پر بیٹھا، اس زمانے میں ریاست کی معاشی حالت بہت خراب تھی۔ زمین کے زرخیز رقبے بلا کاشت پڑے ہوئے تھے۔ ملک میں 91-1889ء، 02-1900ء، 07-1906ء اور 1910ء میں ہیضہ کی بیماری پھیل گئی تھی۔ اس سے پہلے 04-1903ء میں طاعون کی وبا پھیلی تھی۔ اس طرح کافی آبادی کا صفایا ہوگیا تھا۔ 1893ء اور 1903ء میں ہلاکت خیز سیلاب آئے جس سے زمین کی پیداوار اور دوسرے مال ومتاع کا نقصان ہوا۔

انگریزوں نے ریاست میں ایک ریاستی کونسل قائم کی۔ ایک سال کے لیے اس کی صدارت دیوان پھمن داس نے کی۔ ایک انگریز افسر سر والٹر لارنس کو بندوبست اراضی کا کام سونپا گیا، اس نے عوام کی بھلائی کے لیے بہت کام کیا۔ مال گزاری کے صحیح تعین کا آغاز ہوگیا۔ تجارت پر محصول گھٹا دیے گئے۔ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی میں سڑکیں بنانے پر خاص توجہ دی گئی۔ پھلوں اور اجناس کی پیداوار میں اضافہ ہوا جس سے ریاست کی آمدن بہت بڑھ گئی۔

مہاراجہ کو سٹیٹ کونسل کا صدر بنا دیا گیا۔ 1905ء میں سٹیٹ کونسل کو ختم کر دیا گیا اور مہاراجہ کے اختیارات بحال ہوگئے۔ کشمیر سے گلگت تک اور گلگت سے ہنزہ تک نیز بونجی سے چلاس تک سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ دریاؤں اور نالوں پر پل تعمیر کیے گئے۔ وادیٔ جہلم کی زیر تعمیر سڑک پختہ ہوگئی

اوراس پرراولپنڈی سے سری نگر تک آمدورفت شروع ہوگئی۔

1905ء میں سری نگر میں سری پرتاپ کالج (SP College) کا قیام عمل میں آیا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا حافظہ بہت تیز تھا۔ وہ سادہ مزاج اور امن پسند تھا۔ اس کی انتہائی خواہش تھی کہ رعایا کے تمام طبقوں اور فرقوں سے ایک جیسا سلوک روا رکھا جائے۔

مہاراجہ ہری سنگھ

ہری سنگھ 30 ستمبر 1895ء کو پیدا ہوا اور اس کی تعلیم و تربیت پر ابتداء سے ہی خصوصی توجہ دی گئی۔ اس نے انگریز اساتذہ کی زیر نگرانی میو کالج اجمیر سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد امپیریل کیڈٹ کالج ڈیرہ دوں میں فوجی تربیت حاصل کی۔ 1915ء میں اُسے ریاستی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ پھر اُسے سٹیٹ کونسل کا ممبر بنا دیا گیا۔ اس طرح اسے لوگوں سے ملنے جلنے اور ان کے مسائل سننے کا موقع مل گیا۔

1925ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی وفات پر ہری سنگھ کو تخت کا وارث قرار دیا گیا چونکہ وہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا اس لیے پڑھے لکھے طبقہ نے اس سے بڑی امیدیں وابستہ کیں۔ اس نے کشمیر میں قحط کے خطرے پر قابو پانے کیلئے بہت محنت کی تھی اس لیے وہ بلاتفریق مذہب و نسل ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول ہوگیا تھا۔

تخت نشینی کے بعد اس نے جموں میں ایک تقریب سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''بحیثیت مہاراجہ میرا مذہب انصاف ہوگا۔''

لیکن کچھ عرصہ بعد اس میں ایک تبدیلی آئی۔ اس نے حکومت کے ہر شعبہ میں راجپوت خاندان کو ترجیح دینا شروع کی۔ کشمیری ہندوؤں اور مسلمانوں پر فوجی ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ مہاراجہ کی فوج میں ہندو ڈوگرے یا مسلمان ڈوگرے بھرتی ہوتے تھے۔ کشمیر کا نہ کوئی ہندو اور نہ مسلمان بھرتی ہوسکتا تھا۔

20ویں صدی کے آغاز میں برصغیر میں مختلف سیاسی تحریکوں کا آغاز ہوگیا تھا۔ ان تحریکوں کا اثر کشمیر پر بھی پڑ رہا تھا۔ 1908ء میں جموں کے چند فارغ التحصیل نوجوانوں نے ینگ مینز مسلم

ایسوسی ایشن Young Men's Muslim Association کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔

1924ء میں سری نگر کے ریشم خانہ (سلک فیکٹری) کے مزدوروں نے اپنے حقوق منوانے کیلئے ایک تحریک شروع کی۔ اس تحریک کو حکام نے بغاوت کا نام دے کر سختی سے کچل دیا۔ تاہم اس تحریک سے مزدوروں میں بیداری پیدا ہوگئی اور انہوں نے اپنے حقوق منوانے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔

جموں کے بعد سری نگر کے نوجوانوں نے بھی خود کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے دارالمطالعہ قائم کیا جہاں یہ لوگ آپس میں ملک کی سیاسی اور معاشی صورت حال پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

کشمیری پنڈت بھی ڈوگرہ حکومت کی اس امتیازی پالیسی سے سخت مایوس تھے کہ ڈوگروں کے سوا باقی سب کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ 31-1925ء کی 6 سال کی مدت کے دوران کشمیری ہندوؤں نے ایک تحریک جاری رکھی جس کے مقاصد میں ملازمتوں میں متناسب حصہ، اخبارات کا اجراء اور انجمن سازی کی آزادی، ریاستی نظم و نسق میں اعلیٰ عہدوں پر مقامی باشندوں کی نمائندگی وغیرہ شامل تھے۔

یہ تحریک ''کشمیر کشمیریوں کے لیے'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ نوجوانوں کی یہ تحریکیں بارآور ہونے لگیں اور ان کے مطالبات تسلیم ہونے لگے۔ اس تحریک کا نام ہی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کشمیری عوام بحیثیت ایک قوم کے شاہراہ آزادی پر قدم آگے بڑھانے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے تھے۔

31 جنوری 1927ء کو پشتینی باشندہ ریاست State Subject کے حق کو قانونی شکل دی گئی۔ مہاراجہ نے ایک آرڈر جاری کیا جس کی رُو سے غیر ریاستی باشندوں پر آئندہ کے لیے ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ نیز اس حکم کی رو سے غیر ریاستی لوگوں کے لیے زرعی اراضیات خریدنے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ یہ قانون اب تک بھارت اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے حصوں میں لاگو ہے۔

1931ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست میں تین سیاسی تنظیموں کے قیام کی اجازت دی۔

1. کشمیری پنڈت کانفرنس　2. ہندو سبھا　3. سکھ شرومنی خالصہ دربار

اس طرح غیر مسلم آبادی کو اپنی آواز بلند کرنے کا قانونی حق مل گیا۔ جبکہ مسلمان بدستور محروم رہے۔ تاہم شاہراہ آزادی پر ہلچل میں اضافہ ہو گیا۔

1931ء کا سال کشمیر کی تاریخ میں ایک قیامت خیز سال تھا۔

ڈی آئی جی پولیس کی ہدایت پر ایک سب انسپکٹر کھیم چند نے نماز عید کا خطبہ دیتے ہوئے امام صاحب منشی اسحٰق کو روک دیا۔ مسلمانوں میں اس مداخلت سے بہت غصہ پھیل گیا پھر 13 جولائی کو سری نگر سنٹرل جیل میں مسلح ڈوگرہ دستوں نے نہتے عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی جس سے 21 افراد شہید ہو گئے اور بے شمار لوگ زخمی ہو گئے۔

1932ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست میں ایک قانون ساز اسمبلی بنانے کا اعلان کیا۔ اب مسلمانوں نے ان خطوط پر سوچنا شروع کر دیا کہ ان کی ایک باقاعدہ سیاسی تنظیم ہونی چاہیئے جو عوام کی رہنمائی کر سکے۔ جموں اور سری نگر میں باہمی مشاورت کے بعد آل جموں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور اکتوبر 1932ء میں پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں ایک اندازہ کے مطابق تین لاکھ مسلمانوں نے شرکت کی۔

مسلم کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں 15-16-17 دسمبر 1933ء کو میر پور میں منعقد ہوا۔ جس میں منتخب اسمبلی کے فوراً قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ 20 جنوری 1934ء کو مہاراجہ نے ریاست میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ 1934ء میں اسمبلی کے لئے انتخابات کرائے گئے جس میں مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی 21 میں سے 19 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔

15 اگست 1938ء کو ریاست میں ''یوم ذمہ دار نظام حکومت'' جوش و خروش سے منایا گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب صدیوں کے بعد ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر عوامی سطح پر اپنے اختلافات کو پس پشت ڈال کر قومی مفادات کی خاطر ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کے لیے سری نگر میں ایک تاریخی جلوس نکالا۔ شاہراہ آزادی پر پیش قدمی کی یہ ایک اور نشانی تھی۔

29 اگست 1938ء کو شیخ عبداللہ کو گرفتار کر کے چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ علاوہ ازیں چوہدری غلام عباس، بخشی غلام محمد، سردار بدھ سنگھ، پنڈت جیالال، پنڈت پریم ناتھ بزاز اور دوسرے کئی

رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ایک ہزار افراد گرفتار ہوئے جن میں تقریباً 5 درجن غیر مسلم شامل تھے۔

3 مئی 1943ء کو ریاست کے وزیر اعظم گوپالا سوامی آئینگر نے استعفیٰ دے دیا۔ ہری سنگھ نے آئینگر کی جگہ راجہ مہاراج سنگھ کو وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ مہاراج سنگھ ایک آزاد خیال سیاستدان تھا۔ وہ اکثر اوقات سری نگر کے قرب وجوار میں گھومتا رہتا اور عوام کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا۔ مہاراجہ نے اس بات کا برا منایا اور پیغام بھیجا کہ وزیر اعظم اور اس کی بیگم کو عوام سے زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہیئے۔ مہاراج سنگھ نے اپنی تقرری کے صرف سوا تین مہینے کے بعد 26 جولائی کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر ریاست سے کنارہ کشی اختیار کی۔

1944ء میں نیشنل کانفرنس نے مستقبل کا منشور ''نیا کشمیر'' کے نام سے جاری کیا۔ جون 1945ء میں وزیر اعظم بی این راؤ نے استعفیٰ دیا اور مہاراجہ نے اس کی جگہ ایک کشمیری پنڈت رام چند کاک کو وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ 1946ء میں نیشنل کانفرنس نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف ''کشمیر چھوڑ دو'' کی تحریک شروع کی۔ شیخ عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس نے بیعنامہ امرتسر کو چیلنج کیا۔ شیخ عبداللہ نے ایک تقریر میں ''کشمیر چھوڑ دو'' ''بیع نامہ امرتسر توڑ دو'' کا نعرہ لگایا۔ اگلے روز شیخ عبداللہ کو راولپنڈی جاتے ہوئے راستے میں گرفتار کر لیا گیا ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا کر تین سال قید کی سزا دی گئی۔

جولائی 1946ء میں آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کا سالانہ کنونشن سری نگر میں طلب کر لیا گیا۔ حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی لیکن مسلم کانفرنس کے قیادت نے حکومت کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے طے شدہ پروگرام کے مطابق اجلاس منعقد کیا۔ حکومت نے مسلم کانفرنس کے رہنماؤں چوہدری غلام عباس اور ان کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس اجلاس میں ایک ایسی تاریخی قرارداد اتفاق رائے سے پاس کی گئی جو آئندہ کے لیے جدوجہد کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی تھی۔ اس قرارداد کو قرارداد ''آزاد کشمیر'' کا نام دیا گیا۔ قرارداد میں مہاراجہ ہری سنگھ سے مطالبہ کیا گیا کہ

موجودہ زائد المیعاد اسمبلی کو برخاست کر کے اس کی جگہ ایک ایسی آئین

سازاسمبلی کا قیام عمل میں لایا جائے جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کی گئی ہو اور جس میں معاشرے کے ہر فرقے اور ہر قومیت کے لوگوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا ہو۔ مجوزہ اسمبلی کو ریاست جموں کشمیر کا آئین مرتب کرنے کا اختیار دیا گیا ہو۔"

10 مئی 1947ء کو صدر مسلم کانفرنس چوہدری حمید اللہ خان نے ایک اخباری بیان میں مہاراجہ ہری سنگھ سے اپیل کی کہ وہ بلا تاخیر ریاست کی مکمل آزادی اور خودمختاری کا اعلان کردے اور ایک دستور ساز اسمبلی بلائے تاکہ ریاستی عوام اپنی خواہش کے مطابق دستور مرتب کرسکیں۔

اس کے بعد 28 مئی 1947ء کو صدر مسلم کانفرنس چوہدری حمید اللہ خان نے جموں میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایک اور دانشمندانہ اعلان کیا کہ:

"ہم سب کیلئے بہتر یہی ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں سے الگ تھلگ رہیں۔ ہم ہندوستان اور پاکستان دونوں سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں کے ساتھ سیاسی اور معاشی تعلقات رکھنا چاہتے ہیں لیکن ہم ان دونوں میں سے کسی کو اپنے اوپر اثر انداز نہیں ہونے دیں گے۔"

(کشمیریز فائٹ فار فریڈم۔ جسٹس یوسف صراف، صفحہ 107)

مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اتفاق رائے سے منظور ہونے والی قرارداد آزاد کشمیر اور اس کے بعد صدر مسلم کانفرنس چوہدری حمید اللہ خان کے متذکرہ بالا دونوں بیانات شاہراہ آزادی کے مقاصد کی مکمل ترجمانی کرتے تھے۔



1947ء کے بعد کا کشمیر

1947ء میں غلامی کے ایک نئے دور کی ابتداء ہوتی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں دو مملکتیں بھارت اور پاکستان وجود میں آتی ہیں۔ کشمیر کے اندر جو سیاسی جماعتیں کام کر رہی تھیں وہ بھی اپنی کم نگاہی، کوتاہ اندیشی، ناتجربہ کاری اور آزادی کی حقیقی روح کے ادراک سے عاری ہونے کی بناء پر دونوں ہمسایہ ممالک کی جذباتی نعرہ بازی اور بلند بانگ دعوؤں کی چکا چوند کا شکار ہو گئیں اور بھارت و پاکستان کو اپنی منزل ٹھہرانے لگیں۔ دونوں ہمسایہ ممالک کی افواج ریاست میں داخل ہو گئیں۔ پاکستان کے بعض طالع آزماؤں نے اپنے مفادات کے تحت اسلام کے نام پر قبائلی لشکر ریاست میں داخل کر دیے اور بھارت نے "جمہوریت سیکولرزم اور قوم پرستی" کی آڑ میں ریاست کو "بیرونی حملہ آوروں سے بچانے" کا بہانہ بنا کر اپنی فوجیں اُتار دیں۔ ڈوگرہ راج کے خلاف کشمیری عوام کی مسلح جدوجہد پس منظر میں چلی گئی اور ڈیڑھ سال تک ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہنے کے بعد یکم جنوری 1949ء کو بھارت اور پاکستان کے درمیان اقوام متحدہ کی مداخلت سے جنگ بندی عمل میں آئی جس کے نتیجے میں ریاست دو حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ ایک حصہ پر بھارتی حکمرانوں نے اپنے گماشتوں کے ذریعے اپنا اقتدار قائم کیا۔ دوسرے حصہ کو پاکستانی حکمرانوں نے مزید دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ گلگت و بلتستان کے وسیع و عریض علاقہ کو براہ راست مرکزی حکومت کے کنٹرول میں دے دیا گیا اور موجودہ آزاد کشمیر کے مختصر سے علاقہ پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ نام نہاد آزاد حکومت قائم کر دی گئی۔ کشمیری عوام سے وعدہ کیا گیا کہ دونوں ممالک اپنی فوجیں نکال کر انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقعہ دیں گے۔ لیکن اب 60 سال گزر گئے ہیں۔ دونوں ممالک اپنے مقبوضہ علاقوں پر اپنا قبضہ مضبوط اور مستقل بنانے کیلئے اقدامات کرتے رہے ہیں۔ بھارت والے آزاد کشمیر کو "پاکستانی مقبوضہ کشمیر" کہتے ہیں اور پاکستان والے اُس طرف کے علاقہ کو "بھارتی مقبوضہ کشمیر" بتاتے ہیں۔

درحقیقت دونوں مقبوضہ ہیں لیکن حکمرانوں نے دونوں طرف کے عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا

کر رکھا ہے۔ کہ "تم آزاد ہو دوسرے غلام ہیں"۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں حکومت مقامی مفاد پرست ٹولے کی مدد سے اپنے ڈھب کے کٹھ پتلی انتظامات قائم کرتی رہتی ہے جو دن رات "اٹوٹ انگ" کا راگ الاپتی رہے۔ ادھر حالت یہ ہے کہ گلگت بلتستان کو بیورو کریسی نے پہلے ہی شیر مادر سمجھ لیا ہے۔ آزاد کشمیر میں صرف وہی حکومت برسراقتدار رہ سکتی ہے جو وزارت امور کشمیر کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی رہے اور اٹھتے بیٹھتے "کشمیر بنے گا پاکستان" کے نعرے لگاتی رہے۔ اُس طرف ریاست کے تمام وسائل پر بھارت کا قبضہ ہے اور ریاست کو معاشی طور پر بھارت کا دست نگر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس طرف ریاست کے وسائل پاکستان کے تصرف میں ہیں اور ریاست کا یہ حصہ پاکستان کا دست نگر بن کر رہ گیا ہے۔ اُس طرف تمام کلیدی آسامیوں پر بھارت سے بیوروکریسی کے نمائندوں کو متعین کیا جاتا ہے۔ اِس طرف کی کلیدی آسامیاں پاکستان کی نوکر شاہی سے پُر کی جاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ریاست کے دونوں حصوں میں برسراقتدار ٹولے نے ان حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور ان کے شب و روز دہلی اور اسلام آباد کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے میں صرف ہوتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کے اقتدار میں رہنے کا دارومدار ہی ان کے آقایانِ ولی نعمت کی خوشنودی پر ہے۔ ان موقعہ پرست عناصر نے ازخود ہی اپنی آزادیوں اور اختیارات پر ایسی قدغنیں قبول کر رکھی ہیں جنہوں نے انہیں بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔

بقول حفیظ جالندھری مرحوم۔

غلامی اپنے ہاتھوں اپنی زنجیریں بناتی ہے
پہن کر پھر یہ زیور ناچتی ہے اور گاتی ہے

بھارتی مقبوضہ کشمیر میں آج تک جتنی بھی حکومتیں برسراقتدار آئی ہیں بھارتی حکومت کی اشیرواد سے آئی ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، شمس الدین، غلام محمد صادق، سید میر قاسم، فاروق عبداللہ اور جی ایم شاہ صرف اسی وقت تک اقتدار کی کرسی پر براجمان رہے جب تک وہ بھارتی حکمرانوں کی مرضی ومنشا کے مطابق کام کرتے رہے۔ جہاں انہوں نے سرتابی کی جرات کی انہیں نکال باہر کردیا گیا۔

جہاں تک نام نہاد آزاد کشمیر کا تعلق ہے۔ اس بارے میں روزنامہ جنگ کے ایک مضمون نگار کا تبصرہ صورت حال کی واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے 1990ء تک آزاد کشمیر میں حکومت سازی کی تاریخ پر یوں روشنی ڈالی تھی۔

"آزاد کشمیر میں اب تک جو بھی حکومت قائم ہوئی ہے۔ اس میں پاکستان کی وفاقی حکومت کا دخل رہا ہے۔ آج تک کوئی بھی حکومت وفاقی حکومت کی اشیرواد کے بغیر قائم نہیں ہوئی اور وزارت امور کشمیر نے آزاد کشمیر کی حکومتوں کے قیام میں اہم رول انجام دیا ہے۔ آزاد کشمیر میں پہلی حکومت کی تبدیلی اس وقت ہوئی جب شہید ملت لیاقت علی خان وزیراعظم تھے۔ اُس دور میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ صدر کا انتخاب کرتی تھی۔ مجلس عاملہ کی سفارش اور شہید ملت کی خواہش کے مطابق کرنل علی احمد شاہ کو صدر مقرر کیا گیا اور اس کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں وزیراعظم پاکستان کی خواہش کا احترام کیا گیا۔ سکندر مرزا کے دور حکومت میں ایک بار سردار عبدالقیوم خان صدر مقرر ہوئے لیکن جب حسین شہید سہروردی وزیراعظم مقرر ہوئے تو اس دور میں آزاد کشمیر میں اہم تبدیلی رونما ہوئی اور سردار ابراہیم کو صدر مقرر کیا گیا۔ 1958ء میں پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آیا اور ایوب خان نے آزاد کشمیر میں بھی تبدیلی کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کے ایچ خورشید کو آزاد کشمیر کی سیاست میں لائے۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب خورشید کو صدارت سے علیحدہ کیا گیا۔ اور عبدالحمید خان کو آزاد کشمیر میں اہم ذمہ داری سونپی گئی۔ ایوب خان کے دور میں سٹیٹ کونسل کے انتخابات ہوئے اور صدارت کیلئے عبدالحمید خان کی حمایت کی گئی۔ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتوں کے احتجاج کے باوجود ایوب خان کی مرضی کے مطابق صدر کا انتخاب عمل میں آیا۔ ایوب خان کے بعد حکومت یحییٰ خان کو ملی۔ انہوں نے فوج کے ایک اعلیٰ افسر عبدالرحمٰن کو آزاد کشمیر کا صدر مقرر کیا۔ بھٹو کے دور حکومت میں ان کی خواہش کے مطابق عبدالحمید خان کی

حکومت قائم ہوئی۔ جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں میجر جنرل ریٹائرڈ عبدالرحمٰن، میجر جنرل ریٹائرڈ حیات خان اور پھر سردار عبدالقیوم خان کی حکومت قائم ہوئی، سیاسی مبصرین کا کہنا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ آزاد کشمیر کی 42 سالہ تاریخ میں جتنی تبدیلیاں آئیں۔ ان میں وفاقی حکومت کا دخل رہا ہے اور اب 29 جون 1990 کو آزاد کشمیر کے انتخاب کے بعد قائم ہونے والی حکومت وزارت امور کشمیر اور وفاقی حکومت کی خواہش کے مطابق ہی قائم ہو رہی ہے۔"

(روزنامہ جنگ جون 1990ء)

دونوں ہمسایہ ممالک بھارت اور پاکستان کی یہ مداخلت حکومت سازی تک ہی محدود نہ رہی بلکہ عوام کی سیاست میں بھی در آئی اور جو سیاسی پارٹی ان دونوں ممالک میں برسرِ اقتدار رہی اس نے اپنی سیاسی جماعت کا دائرہ کار جموں کشمیر تک وسیع کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ جہاں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مختلف اوقات میں انڈین نیشنل کانگریس، جنتا پارٹی اور جنتا دل کی شاخیں قائم کی گئیں وہاں آزاد کشمیر میں بھی عوامی لیگ، ری پبلکن پارٹی، آزاد پاکستان پارٹی، این پی پی، پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہوئیں اس وقت بھی آزاد کشمیر میں مسلم لیگ کے نام سے دو گروپ اور پیپلز پارٹی کے نام سے دو تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بھارت و پاکستان کے حکمرانوں کے ایماء پر اور ان کے تعاون سے قائم ہونے والی یہ تنظیمیں کشمیری عوام کی نہیں بلکہ غیر ملکی حکمرانوں کے مفادات کا تحفظ کرتی رہی ہیں۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں جاری موجودہ مسلح تحریک مزاحمت میں بھی پاکستانی حکمرانوں نے اپنے پروردہ سیاسی عناصر کے ذریعے (جنہیں سابق صدر ضیاء الحق نے "ہمارے حمایت یافتہ سیاستدان" کا نام دیا تھا) اپنے گروپ بنوائے ان میں سے کئی گروپوں کے تو نام بھی جنرل ضیاء الحق مرحوم کے نام پر ضیاء فورس، ضیاء کمانڈوز، ضیاء ٹائیگرز وغیرہ رکھے گئے تھے۔

ان حمایت یافتہ سیاستدانوں کے ذریعے اب بھی پاکستانی حکمرانوں کا طبقہ موجودہ جدوجہد آزادی سے اپنی پسند کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کبھی کشمیری عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جموں کے ہندو اور لداخ کے بدھ کبھی کشمیری مسلمانوں کے ساتھ نہیں رہ

سکتے اس لیے ڈکسن پلان کے تحت ریاست کو تقسیم کیا جانا چاہیے اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ گلگت اور بلتستان کبھی کشمیر کا حصہ نہیں رہے اس لیے ان علاقوں کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔

لیکن اب حالات بہت بدل چکے ہیں گزشتہ ساٹھ سال کے تجربوں نے کشمیری عوام کو شعور و آگہی کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں عوامی جمہوری انقلاب جس تیزی سے کامیابی سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔ کشمیری عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گزشتہ 15 سال کے دوران سوویت روس کی شکست و ریخت کے نتیجہ میں کشمیر کے پڑوس میں دس سے زائد نئی آزاد جمہوری ریاستیں وجود میں آ چکی ہیں۔ کشمیری عوام کی موجودہ بھرپور تحریک آزادی نے مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں عالمی رائے عامہ میں بھی انقلابی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اب اس مسئلہ کو بھارت اور پاکستان کا باہمی سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ سوا کروڑ کشمیری عوام کی قومی آزادی کے سوال کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔ جوں جوں عالمی سطح پر، جموں و کشمیر کی خودمختاری کی تائید میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے توں توں مفاد پرست عناصر اور بیرونی حمایت یافتہ سیاستدان کشمیر کی قومی آزادی کا راستہ روکنے کی مہم میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ اسے بھارت، اسرائیل، روس، امریکہ اور نہ معلوم کس کس کی سازش اور نیو ورلڈ آرڈر کا حصہ قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر روس جیسی سپر پاور لیتھوانیا، لاٹویا، اسٹونیا، مولداویا، آذربائیجان، قازقستان، ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، آرمینیا، یوکرائن، بائیلو رشیہ، جارجیہ اور کرغیزستان کو بزور طاقت اپنے تسلط میں نہیں رکھ سکی تو بھارت اور پاکستان کی حکومتیں بھی کشمیری قوم کی آزادی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکیں گی۔

کشمیر کے عظیم دانشور، صحافی اور سیاسی مفکر پنڈت پریم ناتھ بزاز نے 1952ء میں اپنی کتاب "آزاد کشمیر" میں سیاسی آزادی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔

- ☆ شخصی تحفظ
- ☆ ہر قسم کی غلامی اور زبردستی سے نجات
- ☆ ہر قسم کی غیر منصفانہ گرفتاری، نظر بندی اور جلا وطنی سے نجات
- ☆ اظہار رائے کی آزادی
- ☆ جماعت بندی اور میل ملاپ کی آزادی

☆ خیال، ضمیر اور مذہب کی آزادی

☆ ٹریڈ یونینز میں شمولیت کی آزادی

☆ ازدواجی زندگی کے حقوق میں آزادی

☆ سفر کی آزادی

☆ نجی، ازدواجی اور خط و کتابت میں مداخلت سے نجات

☆ اپنے افکار و نظریات کی اس ملک کی اجازت سے عوام کی حکومت بنانے اور اس میں حسب پسند نمائندے بھیجنے کیلئے عوام پورے آزاد ہوں گے۔

(پنڈت پریم ناتھ بزاز "آزاد کشمیر" فیروز سنز 1952ء صفحہ 82)



RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF

قبائلی حملہ آوروں کی یلغار اور اس کے اثرات

22 اکتوبر 1947ء کو پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو اطلاع دی کہ پانچ ہزار 5000 قبائلی لشکر مظفر آباد کے راستے وادئ کشمیر میں داخل ہو گیا ہے۔ یہی اطلاع جنرل گریسی نے پاک و ہند افواج کے سپریم کمانڈر سر کلاڈ آکنلک کو بھی دی۔ اس اطلاع پر قائداعظم کا فوری ردعمل یہ تھا۔ ''مہاراجہ کے ساتھ ہمارا جو معاہدہ ہوا ہے اس کا کیا بنے گا!''

یاد رہے کہ اس سے قبل مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت اور پاکستان دونوں کے سامنے ''معاہدہ جاریہ'' (Stand still agreement) کی تجویز رکھی تھی۔ بھارت نے اس کا کوئی جواب نہ دیا جبکہ پاکستان نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ چنانچہ 12 اگست 1947ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ٹیلی گرامز کے ذریعہ پاکستان کیساتھ معاہدہ جاریہ کر لیا۔ بعد میں 15 اگست 1947ء کو ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کے مابین سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ پر دستخط ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں حکومت پاکستان کو 15 اگست 1947ء کے معاہدہ جاریہ کے تحت کشمیر میں ریل، ڈاک، تار اور دریائی تجارت پر کنٹرول حاصل ہو گیا۔ برطانوی مصنفہ وکٹوریہ سکوفیلڈ کی نظر میں 15 اگست 1947ء کو جموں کشمیر سٹیٹ کو وہ خود مختاری واپس مل گئی جس سے 1586ء میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے سامنے کشمیر کا بادشاہ یعقوب شاہ چک دستبردار ہو گیا تھا۔ ریاست کی یہ خود مختاری صرف تہتر (73) دن قائم رہی۔

(کشمیر ان دی کراس فائر۔ وکٹوریہ سکوفیلڈ۔ صفحہ 132)

وکٹوریہ درست کہتی ہے کہ 15 اگست کو پاکستان کے ساتھ برابری کی سطح پر کشمیر کا ایک معاہدہ ہوا

تھا۔ 27 اکتوبر کو بھارت نے اپنی افواج ہوائی جہازوں کے ذریعہ اتار کر جموں کشمیر کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ اس طرح کشمیر کی آزادی صرف تہتر دن قائم رہی۔

یکم نومبر 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ دونوں گورنر جنرل یہ اعلان کریں کہ کشمیر میں فریقین 48 گھنٹے کے اندر اندر جنگ بندی کر دیں اور قبائلیوں کو یہ انتباہ کیا جائے کہ اگر وہ فوری طور پر جنگ بندی کا حکم نہیں مانیں گے تو دونوں ملکوں کی افواج ان کے خلاف مشترکہ کارروائی کریں گی۔

(انسائیکلوپیڈیا قائداعظم صفحہ 595)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس تجویز کا کوئی جواب نہ دیا۔

وزیراعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان نے لاہور میں ایک کانفرنس طلب کی۔ کانفرنس میں سرحد کے خان عبدالقیوم خان، پنجاب کے نواب ممدوٹ، شوکت حیات خان، میجر جنرل اسکندر مرزا، بریگیڈئیر شیر خان اور بریگیڈئیر اکبر خان نے شرکت کی۔ پاکستانی فوجی افسروں نے جموں کشمیر پر قبضہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ وزیراعظم نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ بھارت پاکستان پر حملہ کر دے گا۔ تاہم کانفرنس میں قبائلی حملہ آوروں کی مدد کرنے، انہیں گولہ بارود فراہم کرنے اور مزید لوگوں کو کشمیر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس طرح کشمیر میں قبائلی یلغار میں سوائے قائداعظم کے ساری پاکستان گورنمنٹ شریک تھی۔

قبائلیوں کی بلاجواز یلغار نے کشمیر اور پاکستان پر گہرے سیاسی، سماجی اور معاشرتی اثرات چھوڑے۔ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ سیاسی طور پر سب سے سنگین نقصان یہ ہوا کہ بھارت کو کشمیر میں اپنی افواج اتارنے کا موقع مل گیا۔ 22 اکتوبر 1947ء کو قبائلی لشکر کشمیر میں داخل ہوئے اور صرف 5 دن بعد 27 اکتوبر کو بھارت نے اپنی افواج ہوائی جہازوں کے ذریعے کشمیر میں اتارنی شروع کی۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ اس وقت بھی کشمیر میں سات لاکھ بھارتی افواج قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔ ان سات لاکھ افواج نے گزشتہ چھ دہائیوں سے کشمیری عوام کا جو حشر کر رکھا ہے وہ دنیا سے چھپا نہیں ہے۔

اس وقت جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں روزنامہ آواز کی 30 اکتوبر 2007ء کی اشاعت میں

بھارتی آرمی چیف دیپک کپور کا یہ بیان شائع ہوا ہے۔ جس کی سرخی ہے۔

”کشمیر میں کہیں بھی فوج کی تعداد کم نہیں کی جائے گی۔“

اس خبر کا مکمل متن ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کشمیر میں کہیں بھی فوج کی تعداد کم نہیں کی جائے گی: بھارتی آرمی چیف

”کراچی (آواز نیوز) بھارتی وزیر دفاع اے کے انتھونی اور آرمی چیف دیپک کپور نے پیر کے دن سرینگر میں فوج اور پیراملٹری فورسز کے ایک مشترکہ دربار میں شرکت کی، 7 سے زائد فوجی کیمپوں میں اہم بریفنگ بھی ہوئی۔ بتایا گیا ہے کہ وزیر دفاع نے کہا ہے کہ کشمیر کے اندر سے کسی بھی جگہ سے فوج کی تعداد میں کمی نہیں ہوگی بلکہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو تازہ دم دستوں کو لایا جائے گا۔ معلوم ہوا ہے کہ وادئ کشمیر کے اندر وزیر دفاع اور آرمی چیف کی اس موومنٹ کو بڑا اہم بتایا جا رہا ہے، بھارتی افواج کو نئے اہداف اور ٹارگٹ پر برتری برقرار رکھنے کیلئے کہا گیا ہے۔ آرمی چیف نے کہا ہے کہ کارگل میں فوج رہے گی اور اپنے مفادات کی حفاظت سے بھارتی فوج غافل نہیں رہے گی۔ بتایا گیا ہے کہ نئے آرمی چیف سے کپور دیپک نے آرمی انٹیلی جنس کشمیر کے یونٹ کے بیس کیمپ کا اکیلے دورہ کیا ہے، ساڑھے 6 گھنٹے تک انٹیلی جنس یونٹ کے افسران کے ساتھ اہم امور پر گفتگو کی ہے اور آنے والے وقت کی روشنی میں نئے اہداف سے ان کو آگاہ کیا ہے۔“

(روزنامہ ”آواز“ 30 اکتوبر 2007ء)

قبائلی یلغار نے سماجی اور معاشی طور پر کشمیر میں جو تباہی مچائی ہے اس پر مورخین اور سیاسی مبصرین نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ”مشتے نمونہ از خروارے“ کے طور پر ہم چند کتابوں سے اقتباسات پیش کر رہے ہیں:

مسلم لیگ کے سابق صدر سردار شوکت حیات خان نے اپریل 1995ء میں روزنامہ جنگ لندن کے ساتھ ایک انٹرویو میں قبائلی یلغار کی تفصیلات بیان کیں۔ بعد میں ان کی کتاب "The Nation that lost its soul" اور اس کا اردو ترجمہ ''گم گشتہ قوم'' شائع ہوا۔ جس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ کشمیر پر قبائلی حملے میں سوائے قائداعظم کے تمام حکومت پاکستان شامل تھی۔ شوکت حیات خان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''مجھے کشمیر آپریشن کا نگران مقرر کیا گیا۔ میں نے بریگیڈیئر شیر خان اور بریگیڈیئر اکبر خان، سابق آئی این اے کے جنرل کیانی اور کرنل دارا کو بھی اس میں شامل کرلیا۔ اس مہم میں وزیر خزانہ غلام محمد نے اپنے ایک رشتہ دار میجر خورشید انور کو شامل کرنے کی سفارش کی۔ اس کی قابلیت صرف یہ تھی کہ وہ اور وزیر خزانہ غلام محمد دونوں ککے زئی تھے۔''

(گم گشتہ قوم۔ سردار شوکت حیات خان۔ صفحہ 278)

''بارہ مولہ میں قبائلیوں نے خورشید انور کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ خزانے سے برآمد شدہ تین لاکھ روپے کی رقم کو قبائلی اپنی ملکیت سمجھنے لگے۔ اس دوران انہوں نے مقامی لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ بارہ مولا کانونٹ (Convent) کی راہباؤں کے لاکٹ اور بندے اتار لئے۔ قبائلیوں نے بازار میں لوٹ مار شروع کر دی اور اس طرح بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوگیا۔''

(ایضاً۔ صفحہ 280)

آزاد کشمیر کے سابق چیف جسٹس محمد یوسف صراف نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''کشمیریز فائٹ فار فریڈم'' میں لکھا:

''قبائلیوں کی ایک بڑی تعداد کوئی وقت ضائع کئے بغیر بارہ مولا کے عوام پر ٹوٹ پڑی۔ چند گھنٹوں کے اندر کئی ایک عمارات نذر آتش کر دیں۔ جہاں تک لوٹ مار اور آتش زنی کا تعلق ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں

کوئی تمیز نہیں برتی گئی۔''

(کشمیریز فائٹ فار فریڈم۔ محمد یوسف صراف۔ صفحہ 906)

فریڈم ایٹ مڈنائٹ کے مصنفین نے قبائلیوں کے کارناموں پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

''بھارتی افواج کو ابتدا میں جو کامیابی ملی اس میں ''فرانسسکن مشنریز'' نام کی ایک تبلیغی تنظیم سے تعلق رکھنے والی ان چودہ (14) راہباؤں (Nuns) کا تعلق بھی ہے۔ جو فرانس، سپین، اٹلی، سکاٹ لینڈ اور پرتگال سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی قبائلی اپنا ''جہاد'' چھوڑ کر ان راہباؤں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے میں مصروف ہو گئے اور سری نگر ائرپورٹ کی طرف قدم بڑھانے کا خیال ترک کر دیا۔''

(فریڈم ایٹ مڈنائٹ۔ سعید سہروردی)

پاکستانی مورخ زاہد چوہدری نے اپنی تصنیف ''پاکستان کی سیاسی تاریخ'' میں لکھتے ہیں۔

''قبائلی لشکر 22 اکتوبر کو مظفر آباد پر قابض ہو گئے۔ اس شہر میں تین دن تک ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ قتل عام کے علاوہ انہوں نے عورتوں کو اغوا کیا۔ انہوں نے اسلامی جذبے کے تحت کشمیر پر حملہ نہیں کیا تھا۔ مظفر آباد اور بارہ مولا کے علاوہ انہوں نے میر پور، پونچھ، کوٹلی، جھنگر، اوڑی اور بھمبر کے قصبوں میں قتل و غارت، لوٹ مار اور اغواء کی وارداتیں کیں۔''

(پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ زاہد چوہدری۔ صفحہ 168)

کشمیر میں قبائلی یلغار کا پس منظر

فریڈم ایٹ مڈنائٹ کے مصنفین نے کشمیر میں قبائلی یلغار کا پس منظر اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

"جب برطانیہ نے تقسیم ہند کا فیصلہ کرلیا تو افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ افغانستان کے جو علاقے انگریزوں نے ہندوستان کے شمال مغربی صوبے میں شامل کیے تھے وہ واپس کیے جائیں۔ انگریزوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ظاہر شاہ نے ایک بار پھر لکھا کہ افغانستان اور ہندوستان کے درمیان ڈیورنڈ لائن کی جو سرحد مقرر کی گئی تھی، وہ ہم سے پوچھ کر نہیں کی گئی ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے وہ علاقے افغانستان کو واپس کیے جائیں۔ انگریزوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے بعد ظاہر شاہ نے خاموشی سے قبائلی علاقوں میں لشکر بھرتی کرنے شروع کیے۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ پشاور سمیت سرحد کے کئی شہروں پر قبضہ کرلیا جائے۔

پاکستان کے ارباب اقتدار کو اس منصوبے کی سن گن ہوئی تو انہیں تشویش لاحق ہوئی۔ باہمی مشورے سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان قبائلی لشکروں کو سری نگر کا راستہ دکھایا جائے۔ اس مقصد کیلئے علماء کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ وہ قبائلی علاقوں میں جاکر قبائلیوں کو جہاد کی ترغیب دیں۔

کشمیر میں حملہ آور ہونے والے قبائل اور ان کے لیڈران کی تفصیل مولوی فضل دین مصنف "انقلاب کشمیر" نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ قارئین کی معلومات کیلئے ہم اس کا خلاصہ پیش کررہے ہیں۔

قبائل کی تفصیل

1- وزیر　　2- محسود

3- سلیمان خیل　　4- دوڑ

5- بھٹنی　　6- توری آف

7- آفریدی　　8- آدم خیل

9- مہمند　　10- مینگل

11- کوچی　　12- زوران

13- شنواری　　14- پاونده

15- یوسف زئی　　16- سالارزئی

17- خلجی　　18- کنڈی

ان کے رہنمایان

1- پیرمانکی شریف　　2- پیرلانڈر

3- کپتان مہر بادشاہ محسود　　4- اندار ملا

5- بادشاہ گل مہمند　　6- دانا پیر

7- پیرزکوڑی

(انقلاب کشمیر۔ مولوی فضل دین۔ صفحہ 108)

کشمیر میں قبائلی لشکروں کے حملے کا پہلا نقصان یہ ہوا کہ بھارت کو کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کرنے کا موقع مل گیا۔

کشمیر کے کئی اضلاع میں بھارت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ میرپور، پونچھ اور مظفرآباد سے یہ جدوجہد گلگت بلتستان تک پھیل گئی تھی۔ گلگت بلتستان میں جدوجہد آزادی کے ہیرو کرنل حسین خان نے اپنی کتاب "جنگ آزادی کی کہانی" میں قلم بند کی ہے۔ شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے بھی اپنی کتاب "آتش چنار" میں لکھا ہے۔

"گلگت کو فتح کرنے کے بعد کرگل اور سکردو تک پہنچ گئے۔ لداخ میں یہ لوگ لیہہ کے قریب لیمو تک پہنچ گئے۔ اگر بھارت ہوائی جہاز سے اپنی فوج نہ اتارتا تو کدن پر مجاہدین کا قبضہ ہوجاتا تھا۔ اس تحریک کا دلچسپ

پہلو یہ ہے کہ کشمیر کی اس مسلح جدوجہد آزادی میں مہاراجہ کی فوج کے قوم پرست اور جمہوریت پسند افسروں نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ لداخ کے شہریوں نے بھی تحریک کی مدد کی۔ پاکستان سے گئے ہوئے قبائلیوں نے اس شیرازۂ آزادی کو تباہ کن نقصان پہنچایا۔"





کشمیر کا مستقبل۔ قائداعظم کی نظر میں

قائداعظم اور مسلم لیگ کا نکتہ نظر یہ تھا کہ ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی جانی چاہیے۔ اس بات کا اظہار قائداعظم نے اپنے دورۂ کشمیر کے اختتام پر 23 جولائی 1944ء کو اپنے بیان میں کیا تھا۔

"ریاست جموں کشمیر ایک شاندار ملک ہے اسے جنت ارضی کا نام دیا گیا ہے۔ مسلم لیگ کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ ریاستی اندرونی معاملات میں مداخلت کرے۔ میں ریاست کے عوام کی خوشحالی اور فارغ البالی کا خواہاں ہوں۔ مسلم لیگ کا موقف یہ ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ معاہدہ کرنے کیلئے آزاد ہیں وہ اپنے لیے مکمل آزادی اور خودمختاری کا اعلان بھی کر سکتی ہیں۔"

(روزنامہ ڈان 22 اپریل)

13 جون 1947ء کو وائسرائے ہند ماؤنٹ بیٹن نے ایک اجلاس میں ریاستوں کے مستقبل پر بات چیت کیلئے بلایا تھا۔ اگلے روز 14 جون کو کانگریس نے ایک قرارداد میں کہا گیا تھا۔

"اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے سے ریاستیں آزاد اور خودمختار نہیں ہو جائیں گی۔ کیونکہ وہ باقی ہند سے الگ نہیں رہ سکتی۔"

(ظہور پاکستان۔ چوہدری محمد علی۔ صفحہ 298-297)

قائداعظم نے قرارداد کی اشاعت کے تین دن بعد 17 جون کو اپنا نقطۂ نظر واضح الفاظ میں یوں بیان کیا:

"آئینی اور قانونی اعتبار سے برطانوی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہندوستانی ریاستیں آزاد وخودمختار ریاستیں بن جائیں گی اور انہیں یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے لئے اپنی پسند کا کوئی راستہ اختیار کریں۔ انہیں یہ حق ہوگا کہ وہ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی یا پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو جائیں یا آزاد وخودمختار حیثیت کو برقرار رکھیں۔"

"میری رائے میں ریاستیں اپنی مرضی کے مطابق خودمختار رہ سکتی ہیں۔ حکومت برطانیہ یا برطانوی پارلیمینٹ یا کوئی اور طاقت یا کوئی ادارہ ریاستوں کی خواہشات اور مرضی کے منافی ان پر کوئی فیصلہ عائد نہیں کر سکتا۔ نہ ہی کسی کو ایسا کرنے کا حق یا اختیار حاصل ہے۔"

(پاکستان ٹائمز۔ 18 جون 1947ء)

11 جولائی 1947ء کو مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ خان اور پروفیسر اسحٰق نے قائداعظم محمد علی جناح سے دہلی میں ان کی رہائش گاہ پر ایک گھنٹہ ملاقات کی۔ دونوں کشمیری رہنماؤں نے قائداعظم سے کشمیر کی موجودہ صورت حال اور کشمیر کے مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ قائداعظم نے اسی روز اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا جو 13 جولائی کے اخبارات میں شائع ہوا۔ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں انہوں نے اپنا نکتۂ نظر ان الفاظ میں بیان کیا۔

"میں ایک سے زیادہ مرتبہ واضح کر چکا ہوں کہ ہندوستانی ریاستیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہوں یا ہندوستان کے ساتھ یا وہ آزاد خودمختار رہیں۔ جو ریاستیں مکمل طور پر آزاد وخودمختار رہنا پسند کریں گی۔ ہم ان کی اس خواہش کا پورا احترام کریں

گے اور باہمی دو طرفہ مفادات کی خاطر ان سے مفید اور اچھے اچھے معاہدے کریں گے۔"

(پاکستان ٹائمز 13 جولائی 1947ء)

10 جولائی 1947ء کو محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کیا گیا اسی روز چوہدری حمید اللہ خان اور محمد اسحٰق قریشی کو پیغام ملا کہ قائداعظم ان سے 11 جولائی کو ملنا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات فوراً کراچی روانہ ہوگئے۔ کراچی پہنچ کر انہوں نے قائداعظم کو پاکستان کا گورنر جنرل بننے پر مبارکباد پیش کی۔

قائداعظم سنجیدہ ہوگئے انہوں نے کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو ایک اہم اور سنجیدہ معاملے پر بات کرنے کیلئے بلایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مہاراجہ ہری سنگھ سے ایک مشترکہ دوست کے ذریعے بات ہوگئی ہے۔ (انہوں نے اس دوست کا نام نہیں بتایا لیکن ہمیں اندازہ ہوگیا کہ وہ نواب بھوپال کی بات کر رہے ہیں۔) انہوں نے کہا کہ میں نے مہاراجہ ہری سنگھ کو اس بات پر رضامند کر لیا ہے کہ کشمیر کو ایک خودمختار ریاست بن جانا چاہیے۔ یہ بات بہت واضح تھی کہ قائداعظم کا ذہن اس بارے میں بہت صاف تھا کہ کشمیر کو کلی اختیارات کی حامل خودمختار ریاست بن جانا چاہیے۔

قائداعظم کے ساتھ اس ملاقات کے بعد چوہدری حمید اللہ خان اور اسحٰق قریشی دہلی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے پریس کانفرنس میں آزاد وخودمختار کشمیر کے نقطۂ نظر کی کھل کر وضاحت پیش کی۔ ان کی بیانات روزنامہ ڈان اور روزنامہ پاکستان ٹائمز میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوئے۔

اسحٰق قریشی کا بیان ہے کہ قائداعظم نے ان دونوں کو ہدایت کی تھی کہ ان کے احکامات جیل کے اندر کشمیری رہنماؤں تک پہنچائے جائیں۔ چنانچہ اگلے دو ماہ وہ ان احکامات کے مطابق عمل کرتے رہے۔ چوہدری غلام عباس نے جیل سے یہ ہدایات بھیجی تھیں کہ مہاراجہ کے خلاف مظاہرے بند کیے جائیں۔

(مارچ 1994ء صفحہ 52,53,54,273,274)

مؤرخ محمد سرور عباسی لکھتے ہیں:

"چنانچہ چوہدری حمید اللہ خان نے مہاراجہ کشمیر کو یہ مشورہ دیا کہ فوراً

ریاست کو خود مختار قرار دیا جائے۔ نیز ایک دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے تاکہ عوام اپنی خواہشات کے مطابق اپنا دستور تیار کریں۔"

(ہفت روزہ کشمیر، جلد 18 شمارہ 40)



RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF



استحصالی طبقہ سے آزادی

بسا اوقات ایک غلام ملک کے عوام طویل جدوجہد کے بعد غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور "اپنی حکومت" قائم کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ کچھ عرصہ بعد انہیں اس تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ غیر ملکی آقاؤں کا ایک "طبقہ" ہے جو ان پر مسلط ہو گیا ہے اور عام انسانوں کی زندگیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اُن کی محرومیاں بدستور قائم ہیں اور آزادی کی تمام تر نعمتیں مٹھی بھر حکمران طبقہ کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ غلام ملکوں کی قومی آزادی کی تحریک جب زور پکڑتی ہے تو ملک کا جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ آخری مراحل میں اس تحریک میں شامل ہو جاتا ہے اور غیر ملکی تسلط سے نجات کے وقت اپنے بے پناہ مالی وسائل، اپنے اثر ورسوخ اور اپنی عیاری سے اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے۔ غریب محنت کش مزدور اور کسان طبقہ استعماری غلامی سے نجات کے نشے میں خندہ پیشانی سے اپنے نئے حکمرانوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ آنکھیں تب کھلتی ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

برصغیر کے ممالک خصوصاً پاکستان کی صورت حال اس کی ایک واضح مثال ہے۔ تحریک آزادی کے آخری ادوار میں مسلمان جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور موقع پرست طبقہ کو، جو انگریزوں کی کفش برداری کو اپنے لئے باعثِ عزت وافتخار سمجھتے تھے۔ یہ نظر آنے لگا تھا کہ پاکستان تو اب بنا ہی چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ مفاد پرست اور زمانہ شناس عناصر جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو کر صفِ اول میں پہنچ گئے۔ جب پاکستان قائم ہوا تو اقتدار محنت کش عوام کی بجائے اُسی جاگیردار، سرمایہ دار اور گدی نشین طبقہ کے ہاتھ میں آ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹنا

شروع کر دیا۔ عوام الناس جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ ان کی مفلسی اور محرومی میں کوئی فرق نہ آیا۔ مغربی پاکستان خاص کر صوبہ سندھ میں بیشتر زرعی زمینیں ہندو جاگیرداروں کی ملکیت تھیں۔ جب وہ ترک وطن کر کے ہندوستان چلے گئے تو ان کی متروکہ زمینیں ان زمینوں پر محنت کرنے والے ہاریوں یا کاشتکاروں کے حصے میں نہیں آئیں بلکہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمان جاگیرداروں کو الاٹ ہو گئیں یا مقامی صاحب اثر لوگوں نے اپنے نام کرا لیں۔ ایک غریب ہاری کا مالک پہلے کوئی ہندو جاگیردار تھا تو اس کی جگہ اب کسی مسلمان جاگیردار نے لے لی۔ ہاری بے چارہ ہاری ہی رہا۔ بعد میں ترقیاتی منصوبوں کے تحت بنائے جانے والے بیراجوں سے جو زمینیں آباد کی گئیں۔ ان سے بھی مقامی بے زمین کسانوں کی قسمت نہ بدلی کیونکہ وہ ان لوگوں کی بجائے ملک کے بااثر افراد زیادہ تر پنجاب سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کو الاٹ کی گئیں۔

اسی طرح ہندو سرمایہ دار بڑے بڑے کارخانے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اُن کے مالک انہیں چلانے والے مزدور نہ بن سکے اور ہندوستان سے آنے والے مسلمان سرمایہ دار راتوں رات اُن کے مالک بن گئے۔ سندھ میں آج جو بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس کے پس منظر میں گزشتہ ساٹھ سال کے دوران پرانے اور نئے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں روا رکھا جانے والا یہی استحصال ہے۔ مشرقی پاکستان کا حال اس سے بھی برا ہوا۔ وہاں کی صنعت پر بیوروکریسی کی مدد سے مغربی پاکستان کے سرمایہ دار قابض ہو گئے۔ رفتہ رفتہ عوام میں احساس محرومی بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ باقی ماندہ پاکستان میں نوبت اب کنفیڈریشن، آزاد بلوچستان اور سندھو دیش جیسی تحریکوں تک پہنچ چکی ہے۔

1947ء کے بعد جموں وکشمیر کے دونوں حصوں میں ایک نئے استحصالی طبقے نے جنم لیا۔ یہ طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا۔ جو تقسیم ہند سے قبل نچلے درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد اقتدار میں آنے یا اہل اقتدار سے قریبی تعلقات پیدا کرنے کے نتیجے میں بڑے بڑے ٹھیکے اور تجارتی اجارہ داریاں حاصل کرنے سے کامیاب ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں دولت میں کھیلنے لگے۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں رسوائے زمانہ B.B.C (بخشی برادرز کارپوریشن) اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ آزاد کشمیر میں بھی اس مراعات یافتہ طبقے میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جائیدادوں کی ناجائز خرید وفروخت اور منشیات کی سمگلنگ سے یہ طبقہ بے پناہ دولت اکٹھی کر رہا

ہے۔ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ صرف میرپور شہر میں گزشتہ چند سال میں حکمران طبقہ کی ملی بھگت سے پلاٹوں کی الاٹمنٹ اور ہیر پھیر سے کئی ارب روپے کے فوائد حاصل کیے جا چکے ہیں۔

جون 1988ء میں ڈاکٹر مبشر حسن سابقہ وزیر خزانہ پاکستان نے اسلامک کونسل آف ورلڈ افیئرز کے تحت سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے الزام لگایا کہ

> ”ہمارا حکمران طبقہ سمگلروں، سول اور ملٹری انٹیلی جنیس، بیوروکریسی، منشیات فروشوں اور وڈیروں پر مشتمل ہے اور گذشتہ دہائی میں حکمرانوں نے صرف اپنے لیے دولت جمع کرنے اور لائسنس اور پلاٹ دینے پر توجہ دی ہے۔“

(جنگ، راولپنڈی، 29 جون 1988ء)

پس ثابت ہوا کہ صرف غیر ملکی استعماری طاقتوں سے نجات کا نام ہی آزادی نہیں۔ اس طرح تو صرف حکمرانوں کے چہرے بدل جاتے ہیں۔ سامراج کی روح اسی طرح قائم رہتی ہے۔ اصل آزادی تو سامراجی تسلط کے خاتمہ کے ساتھ اس کے چھوڑے ہوئے استحصالی نظام کو ختم کر کے اور اس کی جگہ سماجی اور معاشی انصاف پر مبنی خالصتاً عوامی جمہوری نظام کے قیام کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ جب تک کسی ملک میں محنت کش عوام کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور گدی نشینوں کا اقتدار اور وجود باقی رہے گا۔ عوام حقیقی آزادی سے محروم رہیں گے۔



معاشی آزادی

بے روزگاری سے آزادی

جب ایک ملک سیاسی طور پر استعماری طاقتوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے تو اس سے اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ملک کو رفتہ رفتہ اقتصادی اور معاشی طور پر بیرونی ممالک پر انحصار سے چھٹکارا دلایا جائے۔ جن پیداواری قوتوں پر غیر ممالک کا کنٹرول تھا انہیں اپنی تحویل میں لے لیا جائے۔ پوشیدہ معدنی وسائل کا کھوج لگایا جائے۔ زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ قلیل المعیاد اور طویل المعیاد منصوبے بنا کر صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ رسل و رسائل کا نظام بہتر بنایا جائے۔ برقی قوت کی پیداوار میں ملکی ضروریات کے مطابق اضافہ کیا جائے۔ درآمدی اور برآمدی تجارت کو اپنے قومی تقاضوں کے مطابق ترقی دی جائے اور اس طرح رفتہ رفتہ ملک کو ہر میدان میں خود کفالت کی راہ پر ڈال دیا جائے۔ سیاسی غلامی کے دور میں یہ سب کچھ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ پالیسی ساز اور منصوبہ ساز اداروں پر غیر ملکیوں کا قبضہ تھا۔ ذرائع پیداوار بھی انہی کے قبضے میں تھے اور ملکی آمدن کا بڑا حصہ قابض سامراجی ملک کے خزانہ میں جاتا تھا۔ سیاسی طور پر بااختیار محب وطن حکومت کیلئے اب اقتصادی ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اس لئے پلاننگ کمیشن مختلف شعبوں میں اہداف مقرر کر کے اپنے قومی وسائل اور بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے ترقیاتی پروگراموں کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اس طرح ملک کی اجتماعی اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرہ کے ہر فرد کا معیار زندگی بلند کر کے اسے معاشی آزادی اور خوشحالی کی نعمتوں سے مالا مال کر سکتا ہے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے باشندوں کی معاشی حالت میں انقلابی تبدیلی آ سکتی ہے۔ ملک پسماندگی سے ترقی پذیری کی منزلیں طے کر کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں دے کر اس نکتہ کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔





پنڈت پریم ناتھ بزاز صاحب اپنی کتاب ''آزاد کشمیر'' میں کشمیر کے معاشی اور اقتصادی صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ہمارے ملک میں اقتصادی اور معاشی ترقی کیلئے بے شمار امکانات موجود ہیں۔ کشمیر ایسے خطے میں واقع ہے۔ جہاں خام پیداوار اور دولت کمانے کے دوسرے وسائل کی اتنی بہتات ہے کہ لوگ آسانی سے ہر ضرورت زندگی وافر مقدار میں حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے پہاڑوں میں ہر قسم کی معدنیات کی ان گنت کانیں ہیں۔ یہاں اتنے وسیع اور گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں کہ عمارتی لکڑی اور ایندھن کا ذخیرہ صدیوں کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسی اشیاء پیدا ہوتی ہیں، جن سے کئی قسم کی دست کاریاں چالو ہو سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں دریاؤں اور قدرتی آبشاروں کی شکل میں اتنی زبردست آبی قوت ہے کہ اس سے عظیم مقدار میں بجلی کی قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔ رنگ برنگے پھول، شیریں اور ستھرے پانی، رسیلے اور میٹھے پھل، قدرت کا لازوال حسن و جمال، دل کش اور رنگین مناظر، نیلگوں جھیلیں کشمیر میں اتنی افراط اور بہتات سے پائی جاتی ہیں کہ دنیا میں اس حسین خطہ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

اگر ہم ان ذرائع کو سیاحانہ تجارت کی شکل دیں تو ملکی آمدنی میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ کشمیر کی گھریلو صنعتیں قالین بافی، کار چوبی، پیپر ماشی، چاندی کے ظرف سازی، یہاں کا سمور (Fur)، اون، پشمینہ اور ریشم تمام دنیا میں اتنی مشہور ہیں کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(آزاد کشمیر۔ پریم ناتھ بزاز۔ صفحہ 96-95)

عوامی جمہوریہ چین:

سب سے پہلے ہم عوامی جمہوریہ چین کی مثال دیں گے۔ یہ عظیم مملکت کشمیر کے شمال اور مشرق میں واقع ہے۔ آج سے نصف صدی قبل تک چین دنیا کے انتہائی پسماندہ ممالک میں شامل

تھا۔ سامراجی طاقتوں کی غلامی نے چینی قوم کو ناکارہ اور ست الوجود قوم بنا کر رکھ دیا تھا۔ افیون کا دور دورہ تھا اور ساری قوم افیون کے نشے میں مبتلا تھی۔ 42-1839ء میں جنگِ افیون Opium War کے نتیجہ میں برطانیہ نے کئی بندرگاہوں پر قبضہ کے علاوہ چین کے اندرونی معاملات میں بھی دخل حاصل کر لیا تھا۔ چینی قوم کی اکثریت انتہائی مفلسی اور ناداری کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ نوبل انعام یافتہ کتاب Good Earth کی مصنفہ پرل ایس بک نے اپنے مشہور ناول میں چینی عوام کی معاشی پسماندگی کی جو دردناک تصویر پیش کی ہے۔ اسے پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے سے اناج کیلئے والدین اپنے بچوں کو فروخت کرنے اور جوان لڑکیوں سے عصمت فروشی کرانے پر مجبور تھے۔ اسی پس ماندہ اور ستم رسیدہ قوم نے اس صدی کے اوائل میں انگڑائی لی اور ایک طویل جدوجہد کا آغاز کیا۔ جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

آخر یکم اکتوبر 1949ء کو ماؤزے تنگ اور چواین لائی کی قیادت میں عوامی جمہوریہ چین کی بنیاد رکھی گئی۔ صرف 57 سال گزرے ہیں۔ اس وقت چین دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے اور نہایت تیزی سے سپر پاورز امریکہ اور روس کے ہم پلہ ہونے کی کوشش میں ہے۔

چین کی فی کس سالانہ آمدن 2005ء میں 5000 ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔ خواندگی کی شرح 2005ء میں 86 فی صد تھی۔ چین نے 1964ء میں پہلا کامیاب ایٹمی دھماکہ کیا۔ اس کے بعد 1967ء میں ہائیڈروجن بم کا دھماکہ کیا اور 1970ء میں پہلا خلائی سیٹلائٹ خلاء میں بھیجا۔ چین کی بحریہ اس وقت دنیا کی عظیم ترین بحری طاقتوں میں شمار ہوتی ہے۔

کیوبا:

اب ایک مثال مغربی دنیا سے پیش کرتے ہیں۔ کیوبا امریکہ کے مشرق میں خلیج میکسیکو میں واقع جزائر غرب الہند میں سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس کا رقبہ 42827 مربع میل ہے یعنی کشمیر

کے نصف کے برابر اور آبادی تقریبا ایک کروڑ ہے یعنی کشمیر کے برابر۔

1492ء میں کولمبس نے جب امریکہ اور جزائر غرب الہند کو دریافت کیا تو اس جزیرہ پر سپین نے اپنا تسلط جمالیا۔ 1895ء تک کیوبا سپین کی غلامی میں رہا۔ 1898ء میں ہسپانوی حکومت کے خلاف بغاوت کے نتیجہ میں کیوبا آزاد ہوگیا۔ لیکن امریکہ نے یہاں کے معاملات میں اپنا عمل دخل قائم کرلیا۔ 1934ء میں ایک فوجی سارجنٹ بتستا Batista نے حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ 1960ء میں کیوبا کے عوام نے فیڈل کاسترو اور چی گیورا کی قیادت میں مسلح تحریک آزادی کے نتیجہ میں ایک عوامی جمہوری حکومت کا قیام عمل میں لایا۔ اس وقت کیوبا کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ غیر وابستہ ممالک کی تنظیم میں کیوبا کو ایک باوقار مقام حاصل ہے۔ صرف بیس سال کے عرصہ میں کیوبا نے کس قدر ترقی کی ہے اس کا ایک تقابلی جائزہ ہم پاکستان کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔

	کیوبا	پاکستان
فی کس سالانہ آمدن	2800ڈالر	2100ڈالر
خواندگی کی شرح	98فی صد	45.7فی صد
اوسط عمر	72سال	61سال
تعلیم پر خرچ (قومی آمدن کا)	9.3فی صد	2.3فی صد
طبی سہولیات	1159افراد کیلئے ایک بستر	1789افراد کیلئے ایک بستر
	416افراد کیلئے ایک ڈاکٹر	2174افراد کیلئے ایک ڈاکٹر

کویت:

اب ہم عرب دنیا سے ایک چھوٹی سی خلیجی ریاست کی مثال پیش کریں گے۔ کویت خلیج فارس کے شمال مغربی سرے پر واقع ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ جس کا رقبہ 7780 مربع میل اور آبادی بارہ لاکھ کے قریب ہے۔ کویت ماضی میں سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہوا کرتا تھا۔ 19ویں صدی کے آخر میں عثمانیوں کو زوال آیا تو کویت کو برطانیہ نے اپنی تولیت میں لے لیا۔ 1934ء میں کویت کے شیخ نے برطانیہ اور امریکہ کی ایک مشترکہ کمپنی ”کویت آئل کمپنی“ کو تیل نکالنے کی اجازت

دی۔ 1961ء میں کویت کی خودمختاری کو تسلیم کرلیا گیا۔ 1975ء میں حکومت نے تیل کے کنوؤں کو سرکاری تحویل میں لے لیا۔ اس وقت کویت اسلامی ممالک کی تنظیم O.I.C عرب لیگ اور غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کا ایک معزز رکن ہے۔ شخصی حکومت ہونے کے باوجود اقتصادی طور پر بہت ترقی یافتہ ہے۔ کویت کی فی کس سالانہ آمدن 8100ڈالر ہے۔

خواندگی کی شرح 83.5فیصد ہے۔ ہر 340افراد کیلئے ایک بستر اور 669افراد کیلئے ایک ڈاکٹر کی طبی سہولت موجود ہے۔ عمر کا اوسط مردوں میں 72 سال اور عورتوں میں 76 سال ہے۔

لیبیا:

براعظم افریقہ کے انتہائی شمال میں چھ لاکھ اسی ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے اس عرب ملک کی کل آبادی 1990ء کی مردم شماری کے مطابق 43لاکھ تھی۔ اس ملک کی غلامی کی تاریخ ہمارے وطن کشمیر سے ملتی جلتی ہے۔ کشمیر کی مانند لیبیا بھی سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک پانچ مختلف ممالک کے زیر تسلط رہا۔ 1510ء میں سپین نے اس پر قبضہ کرلیا۔ 1530ء میں سپین والوں نے اسے مالٹا کے سرداروں کے حوالے کردیا۔ 1551ء میں ترکی نے اسے زیر تسلط لاکر سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا۔ ساڑھے تین سو سال تک لیبیا سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ رہا۔ 1914ء میں اٹلی نے جنگ میں ترکی کو شکست دے کر لیبیا پر قبضہ کرلیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران 1943ء میں اتحادیوں کے ہاتھوں اٹلی کو شکست ہوئی اور لیبیا کو برطانیہ اور فرانس نے آپس میں تقسیم کرلیا۔

کشمیر پر 1586ء میں مغلوں نے قبضہ کرلیا۔ 1753ء میں افغانوں نے مغلوں کو شکست دے کر کشمیر کو اپنے تسلط میں لایا۔ 1819ء میں پنجاب کے سکھوں نے افغانوں کو نکال باہر کیا اور کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ 1846ء میں ایک مقامی سردار گلاب سنگھ نے پوری ریاست پر حکمرانی کا حق 75لاکھ روپے میں خرید لیا اور اپنی حکمرانی قائم کی۔ جو سو سال تک جاری رہی۔ 1947ء میں بھارت اور پاکستان کی فوجیں کشمیر میں داخل ہوگئیں۔ اور اس پر قبضہ کرکے اسے عملاً دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔

لیبیا کو 1951ء میں خودمختاری حاصل ہوگئی اور یہاں بادشاہت قائم ہوگئی۔ 1969ء میں کرنل معمر قذافی نے شاہ ادریس کا تختہ الٹ کر بادشاہت کا خاتمہ کردیا اور ملک میں عوامی جمہوریت کا

قیام عمل میں لا کر اور معیشت کو سوشلزم کی بنیادوں پر ڈال کر نئے دور کا آغاز کیا۔ گذشتہ 32 سال کے دوران لیبیا نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ انقلاب کے صرف دس سال بعد لیبیا کی فی کس سالانہ اوسط آمدن 5583 ڈالر تک پہنچ گئی تھی۔ جبکہ اس دوران بھارت کی فی کس سالانہ آمدن صرف 162 ڈالر اور پاکستان کی 182 ڈالر تھی۔ لیبیا میں ہر 266 افراد کیلئے ہسپتال کا ایک بستر اور ہر 823 افراد کیلئے ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر کی سہولت موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں بھارت میں 571 افراد کیلئے ایک بستر اور 2471 افراد کیلئے ایک ڈاکٹر دستیاب تھا۔ اور پاکستان میں 1783 افراد کیلئے ایک بستر اور 2174 افراد کیلئے ایک ڈاکٹر کی سہولت دستیاب ہے۔

عوامی جمہوریہ لیبیا کی مختلف شعبوں میں ترقی کی رفتار اور ہمارے خطے کے ممالک کے ساتھ اس کا تقابلی جائزہ ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ 2005ء میں شرح خواندگی 82.6 فی صد اور سالانہ آمدن فی کس 6400 ڈالر تھی۔

سنگاپور:

آیئے اب ذرا مشرق کی طرف چلیں۔ برما اور ملائشیا سے آگے ایک چھوٹی سی ریاست ہے سنگاپور۔ پہلے یہ ملائیشیا کی فیڈریشن میں شامل تھی۔ لیکن 23 سال قبل اسے خودمختاری حاصل ہوگئی۔ 1988ء میں پاکستان کے ممتاز ادیب اور کالم نگار منو بھائی نے سنگاپور کی سیاحت کے بعد روزنامہ جنگ میں "دل کے بجھنے کا سبب" کے عنوان سے کالم لکھا۔ ہم اس کالم کے کچھ اقتباسات منو بھائی کے شکریہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

منو بھائی لکھتے ہیں:

"ہمارا ملک چالیس سال پہلے آزاد ہوا تھا۔ عوامی جمہوریہ چین نے ہم سے ایک سال بعد آزادی حاصل کی تھی اور سنگاپور کو جو اگست 1965ء میں ایک آزاد ملک بنا تھا، آزادی حاصل کیے ابھی صرف 23 سال ہوئے ہیں۔ سوشلسٹ ملکوں سے اپنا موازانہ مناسب نہیں ہے۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام رکھنے والے ملکوں سے تقابل لازمی ہو جاتا ہے۔ اور یہی تقابل دل

کے بجھنے کا سبب بن جاتا ہے۔ جب پتہ چلتا ہے جتنی زمین ہمارے ملک میں ہر سال سیم اور تھور کی وجہ سے بے کار ہو جاتی ہے۔ اتنی ہی زمین سنگاپور والے ہر سال سمندر سے چھین لیتے ہیں۔ ہم پرانی روشنی اور نئی روشنی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور ناظرہ قرآن پڑھنے والوں کو بھی پڑھے لکھے لوگوں میں شمار کر کے بائیس فی صد خواندگی کی شرح بتاتے ہیں۔ مگر سنگاپور والوں نے 23 سالوں میں خواندگی کی شرح 88 فیصد تک پہنچا دی ہے۔ اب وہاں صرف وہی ان پڑھ ہیں جو ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے ہیں۔ بے روزگاری کا وجود ہی نہیں ہے۔"

منو بھائی مزید لکھتے ہیں۔

"میں نے سنگاپور میں اپنے پانچ دنوں کی باتیں بیان کرنی ہیں۔ باتیں بھی صرف تین ہیں ایک بات سنگاپور کے لوگوں کی، دوسری بات سنگاپور کی ٹریفک کی اور تیسری بات سنگاپور کی صحافت کی۔ لوگوں کی بات یہ کہ 61 فی صد چینی، 15 فیصد ملائشین، 6 فیصد پاکستان، بھارت اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کے لوگ ہیں۔ مگر ان میں کسی قسم کا نسلی، علاقائی یا لسانی تفرقہ نہیں پایا جاتا اور یہ تمام کے تمام لوگ اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہیں۔ اس شہر میں عرب سٹریٹ بھی ہے۔ بصرہ سٹریٹ بھی ہے۔ مسلم سٹریٹ بھی ہے۔ بغداد سٹریٹ بھی ہے۔ چائنا ٹاؤن بھی ہے۔ Little India لٹل انڈیا بھی ہے۔ مساجد بھی ہیں۔ مندر بھی ہیں۔ گرجے بھی ہیں اور بدھ عبادت گاہیں بھی ہیں۔ مگر کوئی مذہبی جھگڑا نہیں ہے۔ کیونکہ سب لوگ مصروف ہیں۔ کسی کے پاس جھگڑے کا وقت نہیں ہے۔ اختلافات اچھالنے کی فرصت نہیں ہے۔

دنیا کی مصروف ترین بندرگاہ ہونے کے علاوہ سنگاپور کا چھانگی انٹرنیشنل ایئرپورٹ دنیا کی چالیس بڑی بڑی ایئر لائنز کی سروس کرتا ہے جو سالانہ

ایک کروڑ مسافر یہاں لاتی اور لے جاتی ہیں۔ اس ہوائی اڈہ سے ایک گھنٹہ میں ستر جہاز اڑتے ہیں۔ سنگاپور کی سڑکوں پر گاڑیوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ مگر کوئی ایک ہارن بھی سنائی نہیں دیتا۔ ٹریفک رولز کی پابندی ہو رہی ہو تو ہارن بجانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سب لوگ ٹریفک کے سگنل کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ سڑکوں پر چلتے وقت اور گاڑیوں میں سواری کے دوران سگریٹ نوشی کی ممانعت کی پابندی کرتے ہیں۔ سگریٹ کا ٹوٹا فرش یا سڑک پر پھینکنے کا جرمانہ پانچ ڈالر ہے۔ اور گزشتہ دس سال سے کسی کو جرمانہ نہیں ہوا۔ کیونکہ کسی قانون پر سختی سے عمل ہو رہا ہو اور کسی سے بھی رعایت نہ کی جاتی ہو تو لوگ پابندی کو اپنی عادت بنالیتے ہیں۔ میری جیب میں پاسپورٹ کے علاوہ شناختی کارڈ بھی تھا۔ اخباری کارڈ بھی تھا۔ مگر کہیں بھی ان کی ضرورت نہیں پڑی جبکہ اپنے وطن میں سڑک پار کرنے کیلئے بھی شناختی کارڈ کی ضرورت پڑتی ہے ......

سنگاپور کے اخبارات میں وہاں کے حکمرانوں کی تصویریں دیکھنے کو نگاہیں ترس گئیں۔ یہاں تک کہ ٹیلی ویژن کی خبروں میں بھی ان کی صورتیں دکھائی نہیں دیتی جو ہم پاکستانیوں کیلئے بہت اچنبھے کی بات ہے۔ سنگاپور کے ایک نیم سرکاری اخبار میں وہاں کے وزیراعظم کی تصویر چھپی تھی مگر وہ بھی اس لیے کہ انہوں نے فار ایسٹرن اکنامک ریویو پر مقدمہ کر دیا تھا اور نیم سرکاری اخبار کا ادارہ یہ اپنے وزیراعظم کے خلاف تھا کہ ان کے اقدام سے آزادئ صحافت پر حملہ ہوا تھا جو کسی طرح قابلِ برداشت نہیں ہے......"

مختصر تاریخ: انیسویں صدی کے آغاز میں اس علاقہ پر سلطان جوہور کی عملداری تھی۔ 1824ء میں سلطان نے اس علاقہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔ 1828ء میں سنگاپور کو برطانوی نوآبادی قرار دے دیا گیا۔ 1942ء میں جاپانیوں نے سنگاپور پر قبضہ کر لیا۔ 1946ء میں اس کی برطانوی نوآبادیت کی حیثیت بحال ہوگئی۔ 1959ء میں اس ریاست کو حکومتی خود اختیاری ولوکل

سیلف گورنمنٹ کا حق دیا تھا۔ 1963ء میں ملائیشیا کا وفاق قائم ہوا تھا سنگاپور بھی ملایا، سراوک اور سباح کے ساتھ اس میں داخل ہوگیا۔ 1965ء میں سنگاپور نے وفاق ملائشیا سے اپنا الحاق قائم کر کے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ صرف دس سال میں جمہوریہ سنگاپور نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ یہاں کے باشندوں کی اوسط سالانہ آمدنی فی کس 2544 ڈالر تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت فی کس سالانہ آمدنی 23700 ڈالر اور خواندگی نے 23.2 فیصد ہے۔

مشرق و مغرب کے چند ممالک کی آزادی کے بعد ترقی و کمال کی ایک جھلک آپ نے ملاحظہ کی۔ آیئے اب اپنے وطن جموں وکشمیر کی اقتصادی حالت کی طرف ایک نظر ڈالتے ہیں۔ حدِ متارکہ جنگ کے دونوں جانب حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ "ہم آزاد ہیں" گزشتہ ساٹھ سال کی "آزادی" سے کیا کچھ حاصل ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

1947ء سے قبل ریاست میں شخصی راج تھا۔ لیکن ریاست اندرونی طور پر خودمختار تھی۔ اس کی اپنی فوج تھی، مالیاتی نظام تھا، خوردنی اجناس کے معاملے میں ریاست بڑی حد تک خودکفیل تھی۔ چاول، گندم، جو، باجرہ، مکی، دالیں اور دیگر اجناس کی پیداوار اتنی تھی کہ باہر سے غلہ منگوانے کی ضرورت صرف خشک سالی وغیرہ کے دنوں میں ہی پڑتی تھی۔ سبزیاں، دودھ، دہی، مکھن، گھی کی وافر پیداوار ملک کی آبادی کیلئے کافی ہو جاتی تھی۔ 60 سال کی "آزادی کے بعد" صورت حال یہ ہے کہ ہندوستانی مقبوضہ علاقہ میں صرف اجناس ہی نہیں سبزیاں، خوردنی تیل، گوشت اور دودھ وغیرہ تک باہر سے آتے ہیں۔ اگر کبھی بانہال کا جواہر ٹنل برف باری کی وجہ سے بند ہو جائے تو وادئ کشمیر میں قحط کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ ریاست کے اُس طرف کی غیر ملکی تجارت ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے اور اِس طرف کی حکومت پاکستان کے ہاتھ میں۔ چنانچہ برآمدات سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ اس طرف ہندوستان کے مرکزی خزانے میں جاتا ہے اور اس طرف کا پاکستان کے خزانے میں۔ چند سال قبل آزاد کشمیر کے سابق صدر حیات خان نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس میں انکشاف کیا تھا کہ بیرونی ممالک میں مزدوری کرنے والے کشمیری محنت کش تین ارب روپے کا زرمبادلہ کماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زرمبادلہ سے آزاد کشمیر کو کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ یہ سب پاکستان کے مرکزی خزانے جاتا ہے۔ ذرائع پیداوار پر دونوں جانب بھارت اور پاکستان کا قبضہ ہے۔ مثال کے طور پر منگلا بند جیسے عظیم منصوبے سے آزاد کشمیر کو

نہ تو بجلی کا کوئی معاوضہ ملتا ہے، نہ ہی پانی کا۔ حتیٰ کہ منگلا جھیل میں پیدا ہونے والی مچھلی کی آمدن بھی واپڈا کے خزانے میں چلی جاتی ہے۔ 1988ء میں واپڈا کے افسر شاکر اللہ خاں نے اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ منگلا ڈیم سے ملک کی زرعی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے پانی کی سپلائی کے علاوہ منگلا پاور ہاؤس سے 400 سے 800 میگا واٹ تک بجلی تیار ہوتی ہے جو پاکستان کی بجلی کی 35 فیصد ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

(ہفت روزہ کشمیر 9 تا 15 فروری 1988ء)

بالکل اس طرح سلال بند سے حاصل ہونے والے بیشتر فوائد حکومت ہند سمیٹ لیتی ہے اور ان کا ریاست کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔

ہفت روزہ کشمیر راولپنڈی کی اشاعت 88-3-28 تا 88-4-11 میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں بتایا گیا کہ صوبہ سرحد کو تربیلا ڈیم سے پیدا ہونے والی بجلی کے خالص منافع سے 89-1988ء کے مالی سال کے دوران تین ارب کی رقم ملے گی۔

واضح رہے کہ پاکستان کے آئین میں درج ہے کہ بجلی اور دوسرے قدرتی وسائل کا خالص منافع اس صوبے کو ملے گا جہاں سے یہ قدرتی وسائل حاصل ہوتے ہیں۔

اب ذرا منگلا ڈیم کی طرف نظر ڈالئے۔ اس عظیم منصوبے کو مکمل ہوئے بیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن اب تک اس کے خالص منافع سے آزاد کشمیر کو ایک پیسہ رائلٹی نہیں ملی۔ اپریل 1988ء میں پاکستان کے وفاقی وزیر منصوبہ بندی ڈاکٹر محبوب الحق نے آزاد کشمیر کا دورہ کیا۔ 4 اپریل 1988ء کو انہوں نے مظفر آباد میں اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ منگلا ڈیم کی رائلٹی کے معاملے کو قومی مالیاتی کمیشن میں پیش کیا جائے گا۔ اس کے بعد مئی 1988ء میں اسلام آباد میں قومی مالیاتی کمیشن کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں اصولی طور پر منگلا بند سے پیدا ہونے والی بجلی کا خالص منافع آزاد کشمیر کو دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ایک اندازے کے مطابق یہ رقم موجودہ پیداوار کے حساب سے دو ارب روپیہ بنتی ہے۔

(کشمیر 10 تا 23 جولائی 1988ء)

اس کے بعد پاکستان کے وزیر خزانہ یٰسین خان وٹو نے بھی اپنے دورہ مظفر آباد کے موقعہ پر اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ آزاد کشمیر کو منگلا ڈیم کی رائلٹی دینے کی فیصلہ وزیر اعظم پاکستان کی سربراہی میں جموں کشمیر کونسل کرے گی۔ انہوں نے یہ خوشخبری بھی دی کہ وفاقی ٹیکسوں میں سے آزاد کشمیر کو حصہ دینے کا فیصلہ ایڈیشنل سیکرٹری وزارت خزانہ پاکستان کی سربراہی میں قائم شدہ ایک کمیٹی کرے گی۔ جس کے ممبران میں آزاد کشمیر کے چیف سیکرٹری اور سیکرٹری خزانہ بھی شامل ہیں۔ تاہم یہ اطلاعات اب تک تشنہ تعبیر ہیں اور ان میں سے کسی پر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں سابق وزیر اعظم آزاد کشمیر سردار سکندر حیات خان کے ایک انٹرویو کا اقتباس پیش کیا جائے۔ جو انہوں نے پاکستان کے ایک مشہور ماہنامے قومی ڈائجسٹ کو دیا تھا۔ وزیر اعظم نے کہا:

> ”آزاد کشمیر میں اس وقت ایکٹ 1974ء نافذ ہے۔ اس سے پہلے یحییٰ خان کے دور میں ایکٹ 1970ء نافذ تھا جو کہ بہتر اور جمہوری تھا۔ اب ایک نیا ادارہ ”کشمیر کونسل“ کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ وزیر اعظم پاکستان اس کے چیئرمین ہیں۔ بعض شعبے ایسے ہیں جن میں حکومتِ آزاد کشمیر کا کوئی دخل نہیں۔ بجلی کے متعلق میں بحیثیت وزیر اعظم کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ کونسل کا سبجیکٹ ہے۔ میں کسی قصبے اور کسی شہر کو بجلی سپلائی کا حکم نہیں دے سکتا۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ ایکسائز اور انکم ٹیکس اور کئی دوسرے محکموں پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ حتیٰ کہ سٹیٹ سبجیکٹ سرٹیفکیٹ کہ کون کشمیر کا باشندہ ہے اور کون نہیں۔ کونسل جاری کرتی ہے پاکستان میں صوبوں کے پاس جو اختیارات ہیں ہمارے پاس وہ بھی نہیں۔

کالا باغ ڈیم نہیں بن رہا۔ بھاشا ڈیم نہیں بن رہا۔ لیکن کوہالہ ڈیم جو ترجیحات میں چوتھے پانچویں نمبر پر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اسے تو بنائیں ہمارا ریونیو بڑھے گا اور بجلی بھی پیدا ہوگی۔ لیکن یہ فیصلہ کرنے کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔ میرے پاس ذرائع ہیں۔ ہمارے کشمیری جو باہر ہیں کہتے ہیں ایک پیسہ حکومت نہ لگائے ہم وسائل فراہم کرنے کو تیار ہیں

ہم سے آپ بجلی خریدیں۔ واپڈا سے کم نرخ پر بجلی فراہم کریں گے آپ کو لیکن میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

منگلا ڈیم ہے اس کی رائلٹی ہمیں ملنی چاہیے۔ جس طرح تربیلہ پر صوبہ سرحد کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر ہمیں رائلٹی دی جائے تو بجٹ میں خسارہ ختم ہو جائے گا۔ اس سے ہمارے لوگوں میں خود اعتمادی بڑھے گی۔ کشمیری عوام اپنے پاؤں پر کھڑے نظر آئیں گے۔ پاکستان میں ریاست جموں کشمیر کی کروڑوں اربوں کی جائیداد ضائع ہو رہی ہے۔ کشمیر کی ملکیت کی جو زمینیں اور جائیدادیں یہاں موجود ہیں۔ ان پر ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔ راولپنڈی میں پونچھ ہاؤس بنا لیکن ہمیں دو گز جگہ بھی نہیں ملی۔ ان شرائط پر بھی نہیں جن پر دوسروں کو دی جا رہی ہے۔

منگلا ڈیم کی رائلٹی ہمیں دیں...... پاکستان میں ریاست جموں کشمیر کی جائیدادیں واگزار کریں اور مرکزی ٹیکسوں میں ہمارا جائز حصہ دیں تو ہم انشاءاللہ خود کفیل ہو جائیں گے۔"

(قومی ڈائجسٹ بحوالہ کشمیر 3 تا 9 مئی 1988ء)

پس ثابت ہوا کہ اقتصادی اور معاشی آزادی کی منزل ابھی بہت دور ہے۔ یہ تبھی حاصل ہو گی جب پہلے ریاست سے غیر ملکی تسلط کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہاں حقیقی عوامی جمہوریت قائم ہو گی جو ریاست کی تعمیر و ترقی کا کام اپنے ہاتھ میں لے گی۔

ابھی ہم ریاستی سطح پر اقتصادی آزادیوں کی بات کر رہے تھے۔ اب ہم فرد کی آزادی کی بات کریں گے۔ جب کوئی ملک سیاسی طور پر غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تو اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس قسم کا نظام معیشت نافذ کرے کہ ملک سے بے کاری اور بیروزگاری کا خاتمہ ہو جائے۔ ہر فرد کو روزگار مہیا کرنا ہر مہذب حکومت کا فرض اولین ہوتا ہے اور روزگار حاصل کرنا ہر شہری کا بنیادی حق ہے یہ کوئی رعائت نہیں ہے۔ جدید مہذب دنیا میں ایک جمہوری معاشرے کی تشکیل One for all and all for one کے اصول پر کی جاتی ہے۔ یعنی فرد معاشرے کیلئے ہے اور

معاشرہ ہر فرد کیلئے اس کی مزید وضاحت یوں ہو گی کہ ایک فرد جو بھی کام سرانجام دیتا ہے اس میں صرف اس کی ذات کا فائدہ نہیں بلکہ پورے معاشرے کا فائدہ بھی زیر نظر ہونا چاہیے اور پورا معاشرہ اپنے ہر فرد کی بہبود اور ترقی کیلئے مصروف عمل ہونا چاہیے۔

روایت ہے کہ خلیفہ ثانی عمر بن خطاب نے فرمایا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو مجھے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اس ایک قول میں بنیادی اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ سٹیٹ کو اپنے ہر شہری حتیٰ کہ ہر جاندار کے معاش کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ اس کا ہرگز یہ معنی نہیں کہ حاکم گھر گھر خیرات بانٹتا پھرے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایسا نظام ترتیب دیا جائے کہ ہر فرد کو روزگار میسر ہو جب تک یہ منزل حاصل نہیں کی جاتی۔ آزادی کا تصور تشنۂ تکمیل رہے گا۔

آخر میں جناب ارشاد احمد حقانی کے ایک مضمون "جنرل ضیاء الحق کا عہد اقتدار۔ ایک جائزہ" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ جو روزنامہ جنگ راولپنڈی کے 28 اگست 1988ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

"میں ابھی حال ہی میں ایک ماہ انگلستان رہ کے آیا ہوں۔ وہ ایک سیکولر سوسائٹی ہے۔ لیکن ان لوگوں نے سماجی اور معاشی دائروں میں سماجی تحفظ مساوات اور انصاف کے تقاضوں کا اہتمام کرنے کی جس قدر کوشش کی ہے اور اس کے کس قدر شاندار نتائج نکلے ہیں۔ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہاں اصولاً ریاست ہر آدمی کی کفیل ہے۔ جو اصلاً ایک اسلامی تصور ہے۔ ہر آدمی ضرورت مند، بے روزگار اور بے سہارا ہوتے ہی ریاست سے قُوتِ لَا یَمُوت کے بقدر امداد حاصل کرنے کا قانونی حق رکھتا ہے۔ یہ اس پر کسی کا احسان نہیں ہے۔ نہ اسے "زکوٰۃ لینے" کی شرمندگی اور خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ ملک کا ٹیکسوں کا نظام ایسا ہے کہ تُوخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ هِمْ تَرَدُّ اِلَا فُقَرَاءِ هِمْ"

دنیا میں درجنوں ایسے چھوٹے ممالک ہیں جو سیاسی طور پر غیر ملکی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد اقتصادی خوشحالی کی نعمتوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ چند کا حال ذیل میں بیان کر رہے ہیں۔

اینڈورا

یورپ میں فرانس اور سپین کی سرحدوں کے درمیان اینڈورا ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔جس کا کل رقبہ 185 مربع میل اور آبادی 1990ء کے اعداد وشمار کے مطابق 51 ہزار ہے۔1278ء سے آزاد وخود مختار حیثیت کی حامل ہے۔اس ریاست کی آمدنی کا واحد ذریعہ سیاحت اور ''سکی انگ'' ہے۔99 فیصد آبادی تعلیم یافتہ ہے۔خوشحالی کے معیار کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس ریاست میں ہر دو افراد کیلئے ایک ٹیلیفون۔ ہر چھ افراد کیلئے ایک ریڈیو اور ہر بارہ افراد کیلئے ایک ٹیلی ویژن کی سہولت موجود ہے۔

انٹی گوا:

جزائر غرب الہند میں 171 میل رقبہ اور 68 ہزار آبادی کی ایک ریاست ہے۔''اینٹی گوا'' (Antigua) اسے 1493ء میں کولمبس نے دریافت کیا تھا۔1633ء سے یہ برطانوی نو آبادی تھی۔ یکم نومبر 1981ء کو برطانیہ نے اسے آزاد کر دیا۔ اس ریاست کی معیشت کا دارومدار سیاحت کی صنعت پر ہے۔1984ء میں یہاں 1,85,000 سیاح آئے۔ یہاں خواندگی کی شرح 90 فیصد ہے۔

برونائی:

برونائی Brunei (دارالسلام) مشرق بعید کی ایک چھوٹی سے آزاد خود مختار سلطنت ہے جس کا کل رقبہ 3226 مربع میل اور آبادی 3,72,000 ہے یہاں کی واحد پیداوار تیل ہے۔ دنیا کی امیر ترین ریاستوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ فی کس اوسط آمدنی 20 ہزار ڈالر سالانہ ہے۔ یہ ریاست یکم جنوری 1948ء سے خود مختار حیثیت کی حامل ہے۔ اس سے قبل برطانوی استعمار کے زیر تسلط رہی ہے یہاں خواندگی کا تناسب 95 فیصد ہے۔

لیختن سٹائن:

یورپ میں سوئٹزرلینڈ کے مشرق اور آسٹریا کے مغرب میں ایک ننھی سی ریاست ''لیختن سٹائن'' واقع ہے۔ یہاں 1866 سے آئینی بادشاہت قائم ہے۔اس ریاست کا کل رقبہ 62 مربع میل ہے اور آبادی (1990ء میں) 30 ہزار ہے۔سیاحت واحد ذریعہ آمدن ہے۔

1988 میں یہاں 71000 سیاح آئے۔یہاں خواندگی کی شرح 100 فیصد ہے۔

لکسمبرگ:

مغربی یورپ میں فرانس کے شمال اور بیلجیئم کے مشرق میں لکسمبرگ نامی مملکت قائم ہے۔ یہاں آئینی بادشاہت کا نظام ہے۔جس کی بنیاد 963ء میں پڑی تھی۔ اس ریاست کا کل رقبہ 998 مربع میل اور آبادی 3,69,000 ہے۔ یہاں خواندگی کی شرح سو فیصد ہے۔

مالدیپ:

بحر ہند میں 1086 چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل مالدیپ کے نام سے ایک جمہوریہ قائم ہے۔ جس کا کل رقبہ 115 مربع میل اور آبادی 2,19,000 ہے۔ مالدیپ 1887ء سے برطانیہ کی نو آبادی تھی۔26 جولائی 1965ء کو اسے خود مختاری حاصل ہوگئی اور 1968ء میں اسے جمہوریہ قرار دیا گیا۔ اس ریاست کی معیشت کا دارومدار سیاحت کے علاوہ ناریل، مچھلی اور مونجھ (Coir) کی پیداوار پر ہے۔1987ء میں یہاں 56 ہزار میٹرک ٹن مچھلی پیدا ہوئی۔ اگرچہ اس ریاست کا شمار دنیا کے غریب ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ تاہم یہاں کی سالانہ اوسط آمدن فی کس 470 ڈالر یعنی پاکستان سے 110 ڈالرز زیادہ ہے۔

ماریشس:

ماریشس Mauritious بحر ہند میں مڈغاسکر سے 500 میل مشرق کی جانب ایک جزیرہ ہے جس کا کل رقبہ 790 مربع میل اور آبادی 11,41,900 ہے یہاں پارلیمانی جمہوریت قائم ہے۔

یہاں کی بڑی پیداوار مچھلی، گنا اور چائے ہے۔ اس کے علاوہ سیاحت قومی آمدن کا بڑا ذریعہ ہے۔ فی کس اوسط آمدن 1400 ڈالر سالانہ ہے۔ خواندگی کی شرح 94 فیصد ہے۔

سینیگال:

سینیگال مغربی افریقہ میں موریطانیہ کے جنوب اور گمبیا کے شمال میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ 75750 مربع میل اور آبادی 77,40,000 ہے۔ 15ویں صدی میں اس پر پرتگال کا قبضہ ہو گیا تھا۔ 17ویں صدی میں اس پر فرانس نے تسلط جمایا۔ 1960ء میں اسے آزادی ملی۔ یہاں جمہوری نظام قائم ہے اور اسے مغربی افریقہ کی بہترین جمہوری ریاست قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کی 92 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ سینیگال کے دارالحکومت ڈاکار میں اسلامی ممالک کا سربراہی اجلاس بھی ہوا تھا۔ یہاں کی زرعی پیداوار میں چاول اور مونگ پھلی قابلِ ذکر ہیں۔ فاسفیٹ کی کانیں اور ماہی گیری آمدن کا اہم ذریعہ ہے۔

سری نام:

سری نام Suriname جنوبی امریکہ کے شمالی ساحل پر واقع ہے۔ رقبہ 63037 مربع میل اور آبادی 4,59,000 ہے۔ یہ ملک ابتداء میں ہالینڈ نے نیویارک کے بدلے حاصل کیا۔ تین سو سال تک ولندیزی تسلط کے بعد 25 نومبر 1975ء کو اسے خود مختاری حاصل ہو گئی۔ یہاں جمہوری حکومت قائم ہے۔ پیداوار میں چاول، کھانڈ، پھل، جنگلات، بکسائیٹ اور جھینگا مچھلی قابلِ ذکر ہیں۔ فی کس اوسط آمدن 3500 ڈالر سالانہ ہے۔ خواندگی کی شرح 2002ء میں 93 فیصد تھی۔

ناورو:

مغربی بحرالکاہل میں خطِ استوا پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ناورو واقع ہے۔ اس کا رقبہ 8 مربع میل ہے اور 2000ء میں اس کی آبادی 12800 نفوس پر مشتمل تھی۔ اسے 1798ء میں انگریزوں نے دریافت کیا۔ 1887ء میں جرمن سلطنت کا حصہ بنا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد مجلس اقوام عالم نے اسے آسٹریلیا کی تولیت میں دے دیا۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ جنگ

ختم ہونے کے بعد 1947ء میں اقوام متحدہ نے اسے آسٹریلیا کی ٹرسٹی شپ میں دے دیا۔ 31 جنوری 1967ء کو اسے آزادی ملی اور یہ ایک جمہوریہ قرار پایا۔ اس ننھی سی ریاست میں فاسفیٹ کی ایک کان ہے جس کی پیداوار اور برآمد نے اسے فی کس آمدن کی لحاظ سے دنیا کی امیر ترین ریاست بنا دیا ہے۔ خواندگی کا تناسب 99 فیصد ہے۔ فی کس سالانہ آمدن 5000 ڈالر ہے۔

سوئٹزرلینڈ

سوئٹزرلینڈ کا رقبہ 15941 مربع میل اور آبادی 66,28,000 ہے۔ یہ ماضی میں سلطنت روما کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا 1291ء میں علیحدگی اختیار کی۔ 1648ء میں خود مختار ملک بن گیا۔ 1848ء میں ایک آئین کے تحت وفاقی طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی گئی جس میں ہر صوبے کو اندرونی طور پر وسیع اختیارات دیئے گئے۔ یہ ملک مکمل غیر وابستگی کی پالیسی پر گامزن ہے اور اس صدی کی دونوں عالمی جنگوں میں بالکل غیر جانبدار رہا۔ اقوام متحدہ کے متعدد شعبوں کے صدر دفاتر اسی ملک میں ہیں۔ یہ ملک یورپین ٹریڈ ایسوسی ایشن اور یورپین کمیونٹی کا ممبر ہے۔ سوئٹزرلینڈ دنیا کی بینکنگ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ بینکنگ اور سیاحت اس ملک کی آمدن کے اہم ذرائع ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں آلو چقندر، دیگر سبزیاں، تمباکو اور گیہوں پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کی گھڑیوں کی صنعت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ علاوہ ازیں مشینری، پنیر، چاکلیٹ اور ادویات دیگر ممالک کو برآمد کی جاتی ہیں۔ 1988ء میں یہاں بجلی کی پیداوار 58 ارب کلوواٹ ہوئی تھی۔ فی کس سالانہ آمدن 26309 ڈالر ہے۔ خواندگی کا تناسب 99 فیصد ہے۔



نقل وحرکت کی آزادی

نقل وحرکت کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی آزاد ملک کے شہری کو جائز مقاصد کیلئے، جن میں کاروبار، تعلیم، تفریح، سماجی، مذہبی اور سیاسی مصروفیات وغیرہ شامل ہیں، ملک کے کسی حصے میں آنے جانے کی آزادی ہو اور بیرونی ممالک کے سفر کیلئے بھی پاسپورٹ اور ویزا حاصل کرنے کا حق حاصل ہو۔ لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ برسر اقتدار طبقہ اپنے سیاسی مخالفین کو ان آزادیوں سے محروم کر دیتا ہے۔

جون 1989ء میں پاکستان کے ایک صوبے (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کی حکومت نے پنجاب سے تعلق رکھنے والے سینیٹر آصف ورد گ کو صوبہ بدر کرنے کے احکامات صادر کئے کیونکہ سرکاری ترجمان کے مطابق سینیٹر صاحب سرحد میں بعض ''ناپسندیدہ'' سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ اس اقدام پر سارے ملک میں صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ چنانچہ حکومت سرحد کو دو ہی دن بعد اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ پاکستان میں ان دنوں جمہوری حکومت قائم تھی۔ اس لیے عوامی احتجاج کا فوری نوٹس لیا گیا۔ مارشل لاء ہوتا تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔

سابقہ دور حکومت میں اکثر و بیشتر یہ خبریں سننے میں آتی رہیں کہ فلاں سیاسی رہنما کے فلاں صوبے میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ کوئی نامور سیاسی رہنما کسی دوسرے صوبہ کے دورے پر جونہی اترے انہیں صوبہ بدری کے احکامات دکھا کر ایئر پورٹ سے ہی واپس کر دیا گیا۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بار اے این پی ANP کے رہنما عبد الولی خان نے کہا تھا۔

''اب پاکستان میں ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے کیلئے بھی
پاسپورٹ حاصل کرنا پڑے گا''

اسی طرح بسا اوقات حکومتیں سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے بیرونی ممالک کے سفر پر



RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF

پابندیاں لگاتی رہی ہیں۔ پاکستان میں نامور عوامی شاعر حبیب جالب، مشہور صحافی حسین نقی، بزرگ مزدور رہنما دادا امیر حیدر اور پاکستان سوشلسٹ پارٹی کے رہنما اور نامور قانون دان عابد حسن منٹو اس قسم کی آزمائشوں میں سے گزر چکے ہیں۔ اور انہیں اپنے پاسپورٹ واگزار کرانے کیلئے عدالت عالیہ سے رجوع کرنا پڑا ہے۔

آیئے اب ذرا اپنے وطن کی طرف نظر ڈالتے ہیں کہ یہاں کیا صورت حال ہے۔ 5 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی اس کے آرٹیکل نمبر 7 (ب) میں کہا گیا تھا۔

"ریاست میں کشمیری عوام کیلئے پریس پلیٹ فارم اور جماعت سازی کی آزادی ہوگی نیز آمدورفت کی مکمل آزادی ہوگی۔ جس میں ریاست سے باہر جانے اور آنے کی آزادی بھی شامل ہے۔"

لیکن عملی صورت کیا ہے؟ جنوری 1949ء سے تادم تحریر حد متارکہ جنگ کی منحوس لکیر کشمیری عوام کیلئے آہنی دیوار بن گئی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں سیز فائر لائن (جسے اب کنٹرول لائن کا نام دیا گیا ہے) کے دونوں جانب مورچے سنبھالے بیٹھی ہیں۔ جنہوں نے کشمیری عوام کیلئے قدرتی راستوں سے آمدورفت کو ناممکن بنا دیا ہے۔ اگر کوئی شامت کا مارا بھی اس لائن سے گزر کر دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے وہاں پاکستانی ایجنٹ اور یہاں ہندوستانی ایجنٹ قرار دے کر تشدد اور قید وبند کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

خیر یہ تو سیز فائر لائن سے آر پار آنے جانے کی بات تھی۔ جبری طور پر تقسیم شدہ ریاست جموں وکشمیر کے تینوں حصوں (بھارتی مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان) میں اندرونی طور پر حکمران اور ان کے گماشتے شہریوں کی نقل وحرکت پر کالے قوانین کے تحت پابندیاں لگاتے رہے ہیں۔

چند مثالوں سے ہم اس کی وضاحت کریں گے۔ یہ مثالیں "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں

شیخ محمد عبداللہ مرحوم 1965ء میں بیرونی ممالک کے دورے پر گئے۔ جس کے دوران انہوں

نے مصر کے صدر ناصر، الجزائر کے صدر بن بیلا، چین کے وزیراعظم چو این لائی اور سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل سے ملاقاتیں کیں اور مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں ان عالمی رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کیا۔ ہندوستان کی حکومت کو ان کی سرگرمیاں ناگوار گزریں۔ چنانچہ انہیں واپس بلا کر ان کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا۔ اور انہیں جنوبی ہند کے ایک دور دراز مقام کوڈائی کنال میں نظر بند کر دیا گیا۔

شیخ صاحب کے علاوہ ریاست کے دوسرے عوامی رہنماؤں کو بھی وقتاً فوقتاً ریاست بدر کیا جاتا رہا ہے اور وہ یہ وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گزارنے پر مجبور ہوتے رہے ہیں۔ ریاست کے اندر بھی سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کی نقل وحرکت پر پابندیاں عائد کرنا وہاں کا ایک معمول ہے۔

بھارتی حکومت ریاست سے ہجرت کر کے آئے ہوئے کشمیریوں کو اپنے عزیز واقارب سے ملاقات کیلئے ویزا دینے میں بھی انتہائی بخل سے کام لیتی رہی ہے۔ چنانچہ ان مہاجرین میں سے لاتعداد لوگ ایسے ہیں جو گزشتہ ساٹھ سال کے دوران اپنے عزیزوں سے ملنے کیلئے ویزا لے کر بھی نہیں جا سکے۔

اسی طرح آزاد کشمیر میں برسر اقتدار طبقہ اپنے سیاسی مخالفین پر اسی طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کی نقل وحرکت کی آزادی سلب کرتا رہا ہے۔ چند سال پہلے 1981ء میں حکومت کے بعض جابرانہ اقدامات کے خلاف میرپور شہر سے جو تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس کے دوران قید وبند کے علاوہ عوام دشمن حکومت، سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی نقل وحرکت پر ناجائز پابندیاں عائد کرتی رہی ہے۔ آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار ابراہیم خان سمیت متعدد سیاسی رہنماؤں کے ریاست میں داخلے پر پابندی لگائی جاتی رہی ہے۔ اسی طرح 1982ء میں میرپور کے مقام پر وکلاء کا ایک کونشن منعقد ہونا قرار پایا۔ اس کونشن میں آزاد کشمیر کے چاروں اضلاع کے علاوہ پاکستان سے بھی بعض نامور قانون دانوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن حکومت نے میرپور آنے والے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ منگلا پل پر آزاد کشمیر کے دو سابق صدر سردار محمد ابراہیم خاں اور کے ایچ خورشید مرحوم کے علاوہ متعدد پاکستانی قانون دانوں کو روک لیا گیا۔ اسی کونشن کے موقع پر

ہمارے عظیم ساتھی سید عبدالوحید بخاری ایڈووکیٹ دریائے جہلم کو پیدل عبور کر کے میرپور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے پارٹی کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے علاوہ وکلاء کے کنونشن میں بھی شرکت کی جس کی پاداش میں انہیں سیالکوٹ سے گرفتار کر کے مارشل لاء کے تحت تین سال کیلئے پابند زنداں کر دیا گیا۔ جہاں ان کے پاؤں میں ہر وقت بیڑیاں پڑی رہیں۔

گلگت بلتستان کے حالات گزشتہ چار دہائیوں کے دوران ناگفتہ بہ رہے ہیں۔ پاکستان کی مرکزی حکومت یہاں ایجنسی نظام کے ذریعے ایف سی آر جیسے کالے قوانین کے تحت انتظام چلاتی رہی ہے۔ سیاسی عمل کو یہاں شجر ممنوعہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ آزاد کشمیر کے سیاسی رہنماؤں کا داخلہ ان علاقوں میں ممنوع رہا ہے۔ جون 1970ء میں مقبول احمد بٹ شہید سمیت متعدد دیگر رہنماؤں کے گلگت جانے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ لیکن 23 اکتوبر 1970ء کو مقبول بٹ شہید کی قیادت میں ایک چار رکنی وفد گلگت جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں پہنچنے پر رات کے بارہ بجے وفد کے اراکین کو حراست میں لے کر ایک جیپ میں سوار کر کے زبردستی علاقہ بدر کر دیا گیا۔ اگلے روز جیپ انہیں سوات کے علاقہ کومیلا میں چھوڑ کر واپس چلی گئی جہاں سے یہ لوگ یکم نومبر کو مینگورہ اور 3 نومبر 1970ء کو راولپنڈی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

مقبول بٹ شہید کی قیادت میں دوسرا وفد 25 نومبر کو گلگت روانہ ہو گیا۔ وفد میں بٹ صاحب کے علاوہ میر عبدالمنان، غلام مصطفیٰ علوی، امان اللہ خان اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔ 26 نومبر کو دفعہ 144 کے تحت ہماری سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ 27 نومبر کو ہمیں گرفتار کر کے گلگت سکاؤٹس کے کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ اور 28 نومبر کو جبری طور پر ہوائی جہاز کے ذریعہ راولپنڈی واپس بھیج دیا گیا۔

9 اپریل 1971ء کو لیگل ڈیفنس کمیٹی کا ایک وفد، جس میں راقم الحروف کے علاوہ ممتاز احمد ہاشمی ایڈووکیٹ اور چوہدری اقبال پرویز ایڈووکیٹ شامل تھے، گلگت روانہ ہو گیا۔ ہمارے گلگت پہنچنے پر ہوٹل اباسین کو، جس میں ہم لوگ قیام پذیر ہو گئے تھے، پولیس نے گھیرے میں لے لیا اور ہمارے لئے ہوٹل سے باہر نکلنا، شہر کے وکلاء سے ملنا اور محبوس گلگتی دوستوں سے ملاقات کیلئے کوئی کارروائی کرنا ناممکن بنا دیا۔ چوبیس گھنٹے کی حبس بے جا کے بعد ہمیں زبردستی ہوائی جہاز میں بٹھا کر

گلگت بدر کر دیا گیا۔

پس جس ملک کے شہریوں کو اپنے ہی وطن کے مختلف حصوں میں جائز آمد و رفت کی بھی آزادی حاصل نہ ہو، وہ ملک آزاد نہیں کہلا سکتا۔ نقل و حرکت کی آزادی انسان کے بنیادی حقوق میں نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر اس بنیادی حق پر جابر حکمرانوں نے قدغنیں لگا رکھی ہیں تو جاننا چاہیے کہ آزادی کی منزل ابھی بہت دور ہے۔







تحریر و تقریر کی آزادی

اقوام متحدہ کے بنیادی انسانی حقوق کے عالمی منشور میں تمام انسانوں کیلئے ایسی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ اپنے خیالات اور نظریات کی تشہیر اپنی زبان سے یا اپنے قلم سے کرنے کا حق رکھتے ہیں اور ان پر کوئی حکومت کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں لگا سکتی۔ اس عالمی منشور پر دیگر ممالک کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے بھی اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔ دونوں حکومتوں نے اپنے اپنے آئین میں شہریوں کیلئے تحریر و تقریر کی آزادی کی ضمانت دی ہے لیکن عملی صورت کیا ہے؟ جب ہم گذشتہ چھ دہائیوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے گذشتہ ساٹھ سال کے دوران ہزاروں کشمیری باشندوں کو قید و بند کی صعوبتوں میں ڈال کر انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنایا کہ وہ ایسے خیالات کا پرچار کرتے ہیں جو حکمرانوں کو پسند نہیں ہیں۔

شیخ محمد عبداللہ مرحوم کشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے۔ 1953ء میں انہیں اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں کو اقتدار سے ہٹا کر جیل میں ڈال دیا گیا کہ انہوں نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں ایسی تجاویز پیش کیں تھیں جو پنڈت نہرو کی حکومت کو منظور نہ تھیں۔ 1970ء میں مقبوضہ کشمیر میں محاذ رائے شماری کو غیر قانونی قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی گئی کہ یہ جماعت عوام کے حق خودارادیت کا مطالبہ کرتی تھی۔

عوام کی آواز دبانے کیلئے اخبارات پر سنسر لگانا حتیٰ کہ سیاسی کارکنوں کی ڈاک پر سنسر بٹھا دینا نوآبادیاتی حکومتوں کا ایک عام دستور رہا ہے۔ 1956ء میں سردار عبدالقیوم خان کے دور صدارت میں تین سیاسی کارکنوں (ولی محمد عادل، ثناء اللہ بٹ اور خواجہ امیر الدین) کو محض اس "جرم" میں رات کی تاریکی میں گھروں سے اغوا کر کے زبردستی سیز فائر لائن کے اس پار دھکیل دیا گیا تھا کہ وہ خودمختار کشمیر کے نعرے کا پرچار کرتے تھے۔

خورشید صاحب مرحوم کے دور صدارت میں مظفر آباد سے شائع ہونے والے پہلے اور آخری





انگریزی اخبار کو اس گناہ میں بند کر دیا گیا تھا کہ اس نے 1947ء میں کشمیر میں داخل ہونے والے قبائلیوں کو Raiders (حملہ آور) لکھا تھا۔ بعد میں جنرل اکبر خان مرحوم نے "Raiders in Kashmir" کے نام سے پوری کتاب لکھ ڈالی لیکن انہیں کسی نے نہ پوچھا۔ خورشید صاحب کے دور میں ہی مسلم کانفرنس کے اس وقت کے نوجوان رہنما شیخ بشارت احمد نے (جو آزاد کشمیر سپریم کورٹ کے جج کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہیں) Azad Kashmir needs attention کے نام سے ایک کتابچہ لکھ کر شائع کرایا تھا۔ انہیں اس پاداش میں کئی ماہ کیلئے نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح میر پور کے میجر راجہ عباس خان مرحوم کے ایک کتابچے Real Azad Kashmir پر پابندی لگا دی گئی تھی کیونکہ اس میں غریب عوام پر حکمرانوں کے مظالم کی روداد بیان کی گئی تھی۔

1971ء میں گنگا طیارہ کے اغوا کے بعد "قومی محاذ آزادی" اور "محاذ رائے شماری" کے کئی سو رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر کے عقوبت خانوں میں ڈال دیا گیا۔ اس موقع پر بھی کراچی، لاہور، گوجرانوالہ، راولپنڈی، میر پور اور مظفر آباد میں کشمیری رہنماؤں کے گھروں پر چھاپے ڈال کر تلاشی لی گئی اور جو بھی ریکارڈ اور لٹریچر ملا ضبط کر لیا گیا۔ یہ ریکارڈ 1973ء میں گنگا ہائی جیکنگ کیس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی واپس نہ ملے اور سارے ضائع ہو گئے۔

1970ء میں ہمارے عظیم قائد مقبول بٹ شہید اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو گلگت سے صرف اس جرم میں گرفتار کر کے بار بار نکالا جاتا رہا ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے ذریعے گلگت بلتستان کے عوام کے بنیادی حقوق بحال کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ محاذ رائے شماری کے سابق صدر عبد الخالق انصاری صاحب کو مارشل لاء کی دفعہ 60 کے تحت اس "الزام" میں تین ماہ قید کی سزا سنائی گئی تھی کہ انہوں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "گلگت بلتستان یحییٰ خان کے باوا کی جاگیر نہیں ہے۔"

28 اکتوبر 1970 کو مقبول بٹ شہید اور ان کے ہمراہیوں کے گلگت پہنچنے پر مقامی حکام کی طرف سے جو حکمنامہ ان کے نام جاری کیا گیا تھا، اس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

از دفتر اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ گلگت

نمبر 70/45 مورخہ 28 اکتوبر 1970ء

بنام مقبول احمد بٹ، امان اللہ، متولی خان وغیرہ

"گلگت میں آپ کی آمد اور عوامی جلسوں جلوس اور تقریروں کے ذریعے عوام کو اس بات کی ترغیب دینے کی خبر نے، کہ وہ اپنے لئے اسی طرح کا حق رائے دہی طلب کریں جس طرح آزاد کشمیر کے عوام کو دیا گیا ہے، اس علاقے میں ہیجان پیدا کر رہا ہے۔ یہاں کے عوام آپ کا اس مقصد کے تحت اس علاقے میں دورہ کے شدید مخالف ہیں کیونکہ انہوں نے آپ کو دورہ کی دعوت نہیں دی ہے۔ بدیں وجہ مقامی انتظامیہ کو عوام کی جانب سے آپ کے خلاف جوابی مخالفانہ مظاہروں کی صورت میں نقص امن کا شدید خطرہ ہے۔

اس لیے آپ کو اس خط کے ذریعہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اس قسم کی کارروائی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی پیشگی اجازت کے بغیر عمل میں نہ لائیں۔"

دستخط: احمد سعید ڈویژنل مجسٹریٹ گلگت

1982ء میں میر پور کے عوام نے واٹر ٹیکس میں اضافے اور پراپرٹی ٹیکس کے خلاف آواز اٹھائی تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی اور لاٹھی، گولی، آنسو گیس، اور اندھا دھند گرفتاریوں کے ذریعے عوام کی اس آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ تحریک بڑھتے بڑھتے پورے آزاد کشمیر میں پھیل گئی اور اس کے بطن سے چار جماعتی اتحاد وجود میں آیا۔ اس کے بعد اڑھائی سال تک مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریوں اور قید و بند کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا بنیادی سبب صرف اور صرف یہی تھا کہ عوام اپنے حقوق کیلئے آواز اٹھاتے تھے اور قلم کو حرکت میں لاتے تھے جو کہ حکمران طبقے کو گوارہ نہ تھا۔

روزنامہ "جنگ" کے ایک شمارہ میں ضیاء کے دور آمریت کے دوران صحافیوں پر روا رکھے جانے والے مظالم کی مختصر روداد شائع ہوئی ہے۔ مضمون نگار نے لکھا ہے:

"آزادی صحافت پر حملوں کے پہلے مرحلے میں 30 جولائی 1977ء کو روزنامہ "مساوات" کے ایڈیٹر جی۔ ایم۔ بدرالدین کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کیا گیا۔ چند ہی دنوں بعد ہفت روزہ "معیار" کے مینجنگ ایڈیٹر کو حراست میں لے لیا گیا۔ پیپلز فاؤنڈیشن پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ کراچی کے دو روزناموں "مساوات" اور "ہلال پاکستان" پر پابندی لگا دی گئی۔ جس کے نتیجہ میں ان اخبارات سے وابستہ 3000 افراد بے روزگار ہو گئے۔ روزنامہ "صداقت" کے ایڈیٹر بشیر احمد رانا کو مارشل لاء کی دفعہ 102 کے تحت وارنٹ دکھائے بغیر گرفتار کر لیا گیا۔ 13 مئی 1978ء کو سمری ملٹری کورٹ نے سچ لکھنے کے جرم میں کوڑوں کے ساتھ ساتھ قید و مشقت کی سزا سنائی اور سزا سنانے کے صرف 70 منٹ بعد سعود اللہ خان (پاکستان ٹائمز) سعید اقبال احمد جعفری (پاکستان ٹائمز) خاور نعیم ہاشمی (مساوات لاہور) اور نثار زیدی (نوائے وقت ملتان) کے جسموں کو کوڑے لگا کر لہولہان کر دیا گیا۔"

اس کے بعد مضمون نگار اعجاز الحق نے اُن صحافیوں کا تفصیلاً ذکر کیا ہے جو مارشل لاء کے دوران حقیقت نگاری کی پاداش میں قید و بند، جرمانوں، کوڑوں اور اخباروں کی بندش، اشتہارات کی بندش کے شکار ہوتے رہے ہیں۔ فہرست میں ان صحافیوں کو دی گئی سزاؤں کی تفصیل بھی درج ہے۔

آوازِ حق بلند کرنے کے "جرم" میں جو اخبارات اور رسائل آمریت کے مظالم کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ اُن میں "پاکستان ٹائمز"، "جنگ" کراچی، "ڈان"، "مساوات" لاہور، "صداقت" لاہور، "الفتح" کراچی، "نوائے وقت" کراچی، ملتان، لاہور، "امن" کراچی، "ہلال پاکستان" کراچی، "سندھ نیوز"، "انقلاب"، "مسلم عوام"، "ویو پوائنٹ"، "چٹان"، "کرنٹ" اور "دھنک" شامل ہیں۔ ان تمام اخبارات اور ان سے وابستہ صحافیوں نے تحریر و تقریر کی آزادی کے بنیادی انسانی حق کیلئے یہ سزائیں برداشت کیں۔ 1988ء میں نئی منتخب حکومت نے اقتدار میں آنے کے بعد تحریر و تقریر پر عائد تمام پابندیاں ختم کر کے پاکستانی عوام کو سکھ کا سانس لینے کا ایک موقع فراہم کیا۔

پاکستان میں اس وقت 1973ء کا آئین نافذ العمل ہے۔ اس آئین کے آرٹیکل 19 میں کہا گیا ہے۔

"ہر شہری کو آزادیٔ تقریر و اظہار کا حق حاصل ہوگا اور پریس کو آزادی حاصل ہوگی۔ جو اسلام کی عظمت، پاکستان یا اس کے کسی حصے کے دفاع سالمیت اور استحکام، غیر ملکی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات، امن عامہ، اخلاقی اقدار، توہین عدالت وغیرہ سے متعلق قانون کی طرف سے عائد پابندیوں سے مشروط ہوگی......"

آمریت کے دور میں آزادیٔ تقریر و اظہار کے حق کو جس طرح پامال کیا جاتا رہا ہے اس کا کچھ بیان پہلے آ چکا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس دور میں فوجی آمریت تسلسل اور تواتر کے ساتھ یہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ وہ ملک میں اسلامی نظام نافذ کر رہی ہے۔ گویا اس طویل دورِ آمریت میں عوام پر جاری رکھی جانے والی تمام سختیاں اور انسانی حقوق پر تمام پابندیاں اسلام کے مقدس نام پر لگائی جاتی رہی ہیں۔ اور اس طرح پاکستان اور اسلام کو ساری دنیا میں بدنام کیا جاتا رہا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مومن کی یوں تعریف کی گئی ہے۔

"کہ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔"

(آل عمران-11)

اس اسلامی قدر پر عمل تبھی ممکن ہے۔ جب ملک میں آزادیٔ اظہار خیال کی کھلی فضا موجود ہو بصورت دیگر کسی بھی سچائی کا بلاخوف اظہار ممکن نہیں رہے گا۔ قرآن پاک کی ایک اور آیت ہے۔

"اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ کو خبر ہے۔"

(النساء:135)

خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر نے آزادیٔ رائے کی ضمانت دیتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"لوگو میں تمہارا امیر بنایا گیا ہوں۔ اگر اچھے کام کروں تو میری مدد کرنا، غلطی کروں تو اصلاح کرنا۔"

لیکن اسلامی نظام کے علم بردار جنرل ضیاء الحق نے سچ کہنے، سچ لکھنے یا حکمرانوں پر تنقید کرنے کی پاداش میں بے گناہ شہریوں پر کوڑے برسائے۔ انہیں جیلوں میں ڈال کر بیڑیاں پہنائیں اور بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا۔

فرانس کا مشہور عام فلسفی اور انقلاب فرانس کا زبردست نقیب والٹیئر انسانی عظمتوں کا علمبردار تھا۔ اس نے آزادی رائے کے حق کو سب حقوق پر افضل قرار دیا تھا۔ اس کا یہ قول آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور رہتی دنیا تک آزادی پسندوں کی رہنمائی کرتا رہے گا کہ

"تم میری چاہے کتنی ہی مخالفت کرو میں پھر بھی تمہارے اس حق میں لڑتا رہوں گا کہ تمہیں میری مخالفت کا حق حاصل ہے......"

پس ہمارے ذہنوں میں ایک ایسی آزاد خود مختار، متحدہ، جمہوری ریاست کا تصور ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے۔ جس میں ملک کے ہر شہری کو اپنے خیالات ونظریات کے اظہار کی انفرادی اور اجتماعی طور پر مکمل آزادی حاصل ہو۔ اس طرح ملک کے ہر شعبہ زندگی میں صحت مند تنقید کی فضا قائم ہوگی جس میں ملک کا کوئی بھی شہری اپنے ضمیر پر کوئی قدغن یا کوئی گھٹن محسوس نہیں کرے گا۔

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذن کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

احمد ندیم قاسمی



عدلیہ کی آزادی

عدالت کسی بھی ریاست کے ان چار ستونوں میں سے ایک اہم ستون ہے جن پر ریاست کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ انسانی اقدار کی حامل مقننہ، دیانتدار اور فرض شناس انتظامیہ اور طاقتور دفاعی مشین کے ساتھ ساتھ ایک آزاد و خود مختار عدلیہ کا وجود کسی بھی ریاست کے استحکام اور خوشحالی کیلئے ازحد ضروری ہے۔ کسی بھی ملک میں آئینی جمہوریت کی تقویت اور اس کے تسلسل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس ملک کی عدلیہ کس حد تک آزاد ہے۔ جب کسی ملک میں جمہوریت ناکام یا کمزور پڑ جائے اور آمریت سر اٹھائے تو اس کا سب سے پہلا وار عدلیہ پر ہوتا ہے۔ ہر آمر کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ عدالتیں اس کے اشاروں پر کام کریں۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے سپریم کورٹ آف پاکستان سے اپنی ریٹائرمنٹ کے موقع پر منعقدہ ریفرنس میں خطاب کے دوران پاکستان میں آمریت کے مختلف ادوار میں عدلیہ کی بے بسی اور حالتِ زار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے فرمایا:

1 "ایوبی آمریت کے دور میں 1956ء کے آئین پر فاتحہ پڑھی گئی اور دوسو کیس میں عدالت عظمیٰ نے اس کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ غصب اقتدار اگر کامیاب ہو تو بجائے خود ایک نئے قانونی نظام کا محرک ہوتا ہے، یوں عدلیہ کے پر کترے گئے اور اس کا دائرہ کار محدود کر دیا گیا۔

(روزنامہ جنگ، 16 اکتوبر 1989ء)

2 یحییٰ خانی دور استبداد میں انتظامیہ کا عدلیہ پر تسلط برقرار رہا۔ ضمیر کی آزادی اتنی ہی محدود تھی جتنا کہ دائرہ اختیار کو گھن لگ چکا تھا۔ کرسی انصاف پر بیٹھ کر عدل گستری کرتے وقت منہ کا ذائقہ کڑوا رہتا تھا۔

(ایضاً)

3 ضیاء الحق کی آمریت کے دور میں 1973ء کا آئین معطل ہونے پر وہی پرانا سوال پھر اٹھا کہ مارشل لاء کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ یہ مقدمہ بھی عدالتِ عظمیٰ نے سنا اور متفقہ طور پر فیصلہ صادر فرمایا کہ ''ملک میں نظم ونسق کی ابتری کے سبب اضطرار کی کیفیت میں محدود وقت کیلئے اقتدار کا غصب کیا جانا جائز ہے۔''

(روزنامہ جنگ 6 اکتوبر 1989ء)

عدالت عظمیٰ نے محدود وقت کیلئے ''غصب اقتدار'' کو اس لیے ''جائز'' قرار دیا تھا کہ آمرِ وقت نے نوے دن کے اندر انتخابات کرا کے اقتدار عوام کو سونپ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن چشمِ فلک نے دیکھا کہ نوے دن کا یہ وعدہ گیارہ سال میں بھی پورا نہ ہوا۔ عدالتِ عظمیٰ کے متذکرہ فیصلہ کے تحت ''نظریہ ضرورت'' سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمہوریت، پارلیمنٹ اور عدلیہ کو مذاق بنا کر رکھ دیا گیا۔ جس کی بنا پر بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے وقار کو زبردست نقصان پہنچا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے خطاب میں اس صورت حال کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

''ضیاء دورِ استبداد میں عدلیہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اب تک تو اس کے زوال اور وقار کا مسئلہ پاکستان کا داخلی مسئلہ تھا۔ مگر اس عہد میں بین الاقوامی معاشرہ میں بھی اس پر نکتہ چینی کی گئی اور عام تاثر جو مہذب دنیا میں پھیلا وہ یہی تھا کہ یہاں کی عدلیہ انتظامیہ کی گود میں بیٹھ کر فیصلے صادر کرتی ہے۔''

(روزنامہ جنگ 6 اکتوبر 1989)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے تاریخ اسلام سے حوالے دیتے ہوئے بعض فقہا کا ذکر بھی کیا جنہوں نے غصب اقتدار میں آمروں اور غاصبوں کا ہاتھ بٹایا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

''تاریخ اسلام غصب اقتدار سے غیر مانوس نہیں ہے۔ اسی سبب روایتی فقہ میں الماوردی جیسے فقہا نے استیلا کو شرعی طور پر جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ غاصب امیر قانون اسلامی کے نفاذ کا عہد کرے اور جناب شاہ ولی

اللہ نے تو اسلامی حکومت کے قیام کے جائز طریقوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے صاف ارشاد فرما رکھا ہے کہ وہ صرف تین ہیں یعنی انتخاب نامزدگی اور غصب۔''

(روزنامہ جنگ 6 اکتوبر 1989ء)

تاہم تاریخ اسلام میں عدلیہ کی آزادی کی بے شمار تابناک مثالیں بھی ملتی ہیں اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب دیانتدار اور باکردار علماء اور فقہا نے ظالم وجابر آمروں یا حکمرانوں کے تحت عہدہ قضا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سیرت نعمان میں حضرت شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ عباسی خلیفہ منصور نے امام ابوحنیفہ کے سامنے قضا کا عہدہ پیش کیا تو امام صاحب نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا۔ منصور نے غصہ میں آ کر کہا ''تم جھوٹ بولتے ہو'' امام صاحب نے کہا ''اگر میں جھوٹا ہوں تو میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں عہدۂ قضا کے قابل نہیں کیونکہ جھوٹا شخص قاضی مقرر نہیں ہو سکتا۔''

(مسلمان قاضیوں کا بے لاگ عدل۔ از سعید عبدالصبور، ص 67)

اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے اور انہیں یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا رہا لیکن وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔

''اندلس کے حکمران عبدالرحمٰن الداخل نے شیخ مصعب بن عمران کو قاضی القضاء کا عہدہ پیش کیا۔ شیخ نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بعد میں عبدالرحمٰن کی وفات پر ان کا بیٹا ہشام بن عبدالرحمٰن تخت پر بیٹھا تو اس نے بھی شیخ مصعب کو قضاء کا عہدہ قبول کرنے کی پیش کش کی اور شیخ نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ کیونکہ عبدالرحمٰن الداخل ایک سخت گیر حکمران تھا۔ اس کے برعکس اس کا بیٹا ہشام نیک نام اور خدا ترس تھا۔ رعایا اسے ''سلطان عادل'' کے نام سے پکارتی تھی۔ قاضی مصعب بن عمران نے ہشام اور

اس کے بیٹے حکم کے دورِ حکومت میں نہایت آزادی سے قاضی القضاہ کے فرائض انجام دیئے اور عدل و انصاف میں کبھی کسی صاحبِ اختیار سے بھی رورعایت نہیں برتی۔"

(مسلمان قاضیوں کا بے لاگ عدل۔ از سعید عبدالصبور طاق ص 57 تا 59)

اندلس ہی کے ایک اور قاضی محمد بن بشیر نے ایک بار امیر حکم بن ہشام کے ایک وزیر کے خلاف فیصلہ دیا اور مقدمہ کے دوران جو گواہ عدالت میں پیش ہوئے ان کے ناموں سے بھی اسے آگاہ نہ کیا۔ وزیر نے یہ معاملہ امیر حکم کے سامنے پیش کیا۔ حکم نے قاضی کو لکھا کہ وزیر کو یہ اعتراض ہے کہ آپ نے بعض گواہوں کے بیانات کے بموجب اس کے خلاف فیصلہ کیا ہے لیکن اسے بالکل علم نہیں کہ اُس کے خلاف کون کون سا گواہ پیش ہوا تا کہ وہ اُن پر جرح کر کے اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ قاضی نے جواب میں لکھا کہ وزیر کے عہدے اور شخصیت کے پیشِ نظر میں نے گواہوں کو اُس کے سامنے پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ گو عدالت میں تو وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن بعد میں انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکتا تھا اور وہ غریب محض اس قصور کی پاداش میں کہ انہوں نے وزیر کے خلاف گواہی دی تھی، مارے جاتے۔"

(ایضاً ص 75 تا 76)

جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے انہیں سزائے موت دی اور سپریم کورٹ نے بھی ان کی اپیل مسترد کر دی اور 4 اپریل 1979ء کو انہیں تختہ دار پر لٹکایا گیا۔

یہ مقدمہ دنیا بھر کے قانون دانوں میں عرصے تک موضوعِ بحث بنا رہا۔ جسٹس جاوید اقبال کا بیان ہے کہ:

"میں دنیا میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں اس مقدمہ کی وجہ سے شرمندگی

اٹھانی پڑتی ہے۔"

سری لنکا کے سابق چیف جسٹس راجہ رتنم نے بھٹو کیس پر ایک کتاب لکھی ہے Crisis In Judiciary جس کا ترجمہ پاکستان میں "عدلیہ کا بحران" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب میں مقدمہ کے آغاز سے لے کر فیصلے تک ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں سماعت اور فیصلہ کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ سماعت کے دوران بعض قانون دان اور مبصرین پاکستان آ کر مقدمہ کی کارروائی دیکھتے رہے ہیں۔ بھٹو کیس کے بارے میں ان قانون دانوں اور مبصرین کی کیا رائے رہی ہے۔ جس کا مختصر سا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

کوچن ہیگن کے پروفیسر ایف سی کرون نے کہا۔

"ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ کی سماعت کو کسی بھی معیار سے منصفانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ تختہ اُلٹنے والے جرنیل ایک خطرناک دشمن کو منظر سے ہٹانا اپنی ایک منطقی ضرورت سمجھتے ہیں۔"

(ایشیا ویک 5 مئی 1978ء بحوالہ میگ ویکلی جلد 11 شمارہ 14)

لندن کے اخبار اکانومسٹ نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا:

"شہادت کا معیار بہت قابلِ اعتراض Questionable تھا۔ گواہان استغاثہ مشکوک لوگ تھے۔ لیکن فوجیوں کی طرف سے جو گزشتہ جولائی سے ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔ عدالت کے پانچ ججوں کو جو کام سپرد کیا گیا تھا وہ بڑا واضح تھا یعنی مسٹر بھٹو کا خاتمہ۔"

(اکانومسٹ لندن 25 مارچ 1978ء بحوالہ میگ ویکلی)

انسانی حقوق کی بین الاقوامی انجمن International Federation of Human rights کے سیکرٹری آئیٹین جاوڈل Eitene Jaudel مقدمے کی کارروائی دیکھنے پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے کہا:

''مسٹر بھٹو کے کیس کی منصفانہ سماعت نہیں ہوئی۔ انہیں انصاف سے محروم کیا گیا۔ وکیل استغاثہ مسٹر رحمٰن سے میری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی۔ دورانِ گفتگو مسٹر رحمٰن نے رازداری سے میرے سامنے انکشاف کیا کہ ''ہمیں بھٹو کو ختم کرنا ہے۔'' کسی نامور قانون دان کی طرف سے ایک بین الاقوامی مبصر کے سامنے اس قسم کی گفتگو ناقابلِ یقین ہے۔ مجھے جیل میں بھٹو سے ملنے کی اجازت دینے سے انکار کیا گیا۔ وکلائے صفائی کے ساتھ چیف جسٹس انوار الحق کا رویہ انتہائی معاندانہ تھا۔ چیف جسٹس انوار الحق کو سپریم کورٹ سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی خواہش کے مطابق فیصلہ حاصل کرنے میں بڑی مہارت سے کام لینا پڑا۔ راولپنڈی میں میری موجودگی کے دوران وکلائے صفائی بڑے پرامید تھے کہ نو میں سے پانچ جج ان کے حق میں تھے۔ پھر ایک جج کو دورانِ سماعت ریٹائر کر دیا گیا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا جج نہیں لگایا گیا۔ اس کے بعد ایک اور جج وحید الدین کو علالت کی بنا پر ریٹائر کر دیا گیا۔''

(ہفت روزہ میگ Mag 5 تا 11 اپریل 1990ء)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اٹارنی جنرل ریمزے کلارک Ramsay Clark نے مقدمے کی سماعت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''مسٹر بھٹو کے ساتھ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں میں ناانصافی کی گئی۔ ان کے خلاف جو شہادت پیش کی گئی وہ سزایابی کے حق میں بالکل نہیں جاتی تھی۔ قانون کے کسی بھی معیار کے مطابق یہ ''سماعت'' نہیں تھی الزامات بے بنیاد اور مجہول تھے۔ گزشتہ چند سال کے دوران میں

دنیا کے کئی ممالک میں گیا ہوں۔ کہیں بھی کوئی بھی شخص ان الزامات پر یقین نہیں رکھتا۔''

(نیویارک ٹائمز 14 فروری 1978ء)

لندن میں منعقد ہونے والے قانون دانوں کے بین الاقوامی کنونشن کی متفقہ رائے میں:

''اس فیصلہ کے ذریعہ انصاف کا خون کیا گیا۔ ضیاء الحق نے بغیر کسی آئینی اختیار کے یعقوب علی خان کو ریٹائر کر کے جالندھر کے انوار الحق کو چیف جسٹس لگایا۔ مسٹر صمدانی اور مسٹر مظہر الحق پر مشتمل لاہور ہائی کورٹ کے بینچ کو ہٹا کر اس کی جگہ مولوی مشتاق حسین کو چیف جسٹس لگایا (جسٹس صمدانی اور جسٹس مظہر الحق نے بھٹو کی حبسِ بے جا کی درخواست منظور کی تھی۔''

(ہفت روزہ میگ Mag 5 تا 11 اپریل 1990ء)

درج بالا تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آمریت کے دور میں عدلیہ کی آزادی کس حد تک مفقود ہو جایا کرتی ہے۔ پاکستان میں اس افسوسناک صورتحال کی وجہ سے اقوام عالم میں ملک کے وقار کو زبردست نقصان پہنچا۔ اگر عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہو تو انتظامی ناانصافیوں یا دیگر آزادیوں مثلاً نقل و حرکت کی آزادی، تحریر و تقریر کی آزادی وغیرہ پر ناروا پابندیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ عدلیہ کی آزادی درحقیقت دیگر تمام آزادیوں کی ضمانت کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر عدلیہ کی آزادی پر ہی قدغن لگا دیا جائے تو دیگر تمام آزادیاں از خود متاثر ہوتی ہیں۔ پورا معاشرہ ایک گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔ خوداعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ عوام الناس ڈر اور خوف کے عارضہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ظلم، جبر، استحصال اور ناانصافی کی طاقتوں کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ کہ سماجی توازن بگڑ جاتا ہے۔ انسانیت کی مثبت قدریں کمزور پڑ جاتی ہیں اور منفی رجحانات سر ابھار کر پورے معاشرے کو اخلاقی طور پر پستی اور گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی تاریخ میں وہ دور انتہائی تباہ کن اور افسوسناک ہوتا ہے جب آمر حکمران عدالتوں کی آزادیاں سلب کر کے ظلم اور تعدی کیلئے انہیں اپنا آلہ کار بنائیں۔ 1932ء میں مولانا ابوالکلام آزاد پر جو مقدمہ بغاوت کراچی

میں چلایا گیا تھا اس میں اپنے عدالتی بیان میں مولانا مرحوم نے فرمایا تھا۔

"تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف و ناانصافی دونوں کیلئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں یہ عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کیلئے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔ تاریخ عالم کی بڑی سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیان مذاہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔"

(قول فیصل ص83)



RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF



تعلیمی آزادی

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948ء کو اتفاق رائے سے انسانی حقوق کا عالمی منشور منظور کیا۔ ادارہ اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک نے، جن میں ہندوستان اور پاکستان بھی شامل ہیں اس منشور پر دستخط کیے ہیں۔

اس کی دفعہ 26 میں کہا گیا ہے۔

1 ہر شخص کو تعلیم کا حق حاصل ہے۔ تعلیم مفت ہوگی کم از کم ابتدائی درجوں میں ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کیلئے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

2 تعلیم کا مقصد انسان کی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کیلئے ممد ثابت ہوگی۔

وہ تمام قوموں اور نسلی و مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کیلئے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

3 والدین کو اس بات کے انتخاب کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے۔

اب یہ اصول تو طے ہوگیا کہ ہر شخص کو تعلیم کا حق حاصل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ تعلیم آئے گی کہاں سے؟ اس کا جواب یہ کہ جس طرح ہر ریاست پر سیاسی آزادی کے بعد یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کیلئے ذریعہ معاش کا بندوبست کرے۔ اسی طرح ریاست کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ جہالت اور ناخواندگی کی لعنت کو ختم کرنے کیلئے جامع اور قابل عمل منصوبے بنائے اور ان پر عمل کرتے ہوئے قوم کے ہر فرد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا بندوبست کرے۔

رسول اللہ کا ارشاد ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَۃٍ

یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

ایک اور جگہ انہوں نے فرمایا ہے کہ

اُطْلُبُ الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِا الصِّیْنِ

ترجمہ: علم حاصل کرو چاہے اس کیلئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑا۔

بھارت اور پاکستان کی صورت حال یہ ہے کہ 1980ء تک ہندوستان کی ناخواندگی کی شرح 66 فی صد تھی اور پاکستان میں 80 فی صد۔ ہندوستان تعلیمی اخراجات پر اپنے بجٹ کا 2.5 فی صد خرچ کرتا ہے جبکہ پاکستان صرف 2.3 فی صد۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کیوبا میں خواندگی کی شرح 97 فی صد ہے اور وہاں قومی آمدن کا 9.3 فی صد تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ اور سنگاپور میں ناخواندگی کی شرح اب فقط 12 فی صد رہ گئی ہے۔ یعنی خواندگی کی شرح 88 فی صد ہو گئی ہے۔

اس ضمن میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ استعماری تسلط کے دور میں غلام ملکوں میں تعلیم کا نظام اس طرز پر ترتیب دیا جاتا تھا کہ قابض ممالک کو اندرونی نظم و نسق اور دفتری نظام چلانے کیلئے مناسب افرادی قوت دستیاب ہوتی رہے۔

ماضی میں جاگیردارانہ نظام اور مطلق العنان بادشاہوں کے ادوار میں عوام کو تعلیم سے محروم رکھنا حکمرانوں کی بنیادی حکمتِ عملی کا ایک اہم جزو رہا ہے۔ مؤرخ ضیاء الدین برنی نے اپنی مشہور کتاب ''سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ'' میں لکھا ہے۔

> ''ہر طرح کے اساتذہ کو سختی سے یہ حکم ہوتا ہے کہ وہ کتوں کے حلق میں قیمتی پتھر نہ ٹھونسیں یا ریچھوں اور خنزیروں کے گلوں میں گلوبند نہ پہنائیں یعنی کمینوں، رذیلوں، نکموں، دوکان دار اور کم اصلوں کو نماز اور روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ارکان اور قرآن مجید کے کچھ پاروں اور کچھ دینی عقائد سے

> زیادہ تعلیم نہ دیں جن کے بغیر ان کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے علاوہ انہیں کچھ نہ پڑھائیں کہ ان کمین نفوس کو عزت نہ مل جائے۔''

یہ اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہو گا کہ کتے، خنزیر، ریچھ، کمینے، رزیل اور کم اصل وغیرہ کی اصطلاحیں کن لوگوں کیلئے استعمال کی گئی ہیں۔

بیشتر اوقات سیاسی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد برسر اقتدار آنے والا طبقہ اپنے مفادات کی خاطر تعلیم کے اسی نظام کو من و عن قبول کر لیتا ہے اور جاری رکھتا ہے جو غلامی کے دور میں قائم ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سکول اور کالج تو کھلتے ہیں لیکن لوگوں کا علمی معیار بلند نہیں ہوتا۔ ان اداروں میں علم کے بجائے جہالت اور تنگ نظری کی پٹی پڑھائی جاتی ہے۔ حکمران اپنے مقاصد کیلئے اپنی پسند کے مضامین پڑھنے پر طلباء کو مجبور کرتے ہیں۔ یعنی امتحان پاس کرنے کی خاطر طلباء ایسے مضامین پڑھنے پر مجبور ہوتے ہیں جن سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یا جن کی کوئی قومی افادیت نہیں ہوتی۔

ہندوستانی مقبوضہ علاقے میں ہندی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ کسی زبان کا پڑھنا یا سیکھنا کوئی بری بات نہیں بشرطیکہ یہ اختیاری ہو لیکن اگر اسے زبردستی ٹھونسا جائے تو یہ علمی آزادی کے منافی ہو گا۔ آزاد کشمیر کے تعلیمی اداروں میں مطالعۂ کشمیر کا کوئی مضمون نہیں پڑھایا جاتا جبکہ مطالعۂ پاکستان لازمی مضمون کے طور پر نصاب میں شامل ہے۔ تاریخ کشمیر کی نہیں بلکہ پاکستان کی پڑھائی جاتی ہے۔ اسلامیات کا مضمون لازمی قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں بھی۔

ایک مرتبہ معاشیات کا فارغ التحصیل ایک امیدوار بنکاری کے ایک شعبہ میں ملازمت کی خاطر انٹرویو کیلئے پیش ہوا۔ اس سے سوال کیا گیا کہ ''قرآن کی کس سورت کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں آتا ہے؟'' امیدوار اس کا جواب نہ دے سکا تو اسے مسترد کر دیا گیا۔ حالانکہ جس مضمون میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی اس سے اس سوال کا کوئی تعلق نہ تھا اور اپنے مضمون میں مذکورہ امیدوار اعلیٰ قابلیت اور اہلیت کا حامل تھا۔ اسی طرح طب کی فارغ التحصیل ایک امیدوار خاتون سے سوال کیا گیا۔

"نیلا بٹ کی کیا اہمیت ہے؟"

آزاد ممالک کی زمامِ اقتدار اگر محبِ وطن اور جدید فکر کے حامل افراد کے ہاتھوں میں ہو تو منصوبہ بندی بھی قومی ضروریات اور امنگوں کے مطابق ہو گی ورنہ صرف کلرک پیدا ہوتے رہیں گے اور بے روزگاری میں اضافہ بھی جاری رہے گا کیونکہ کلرکوں کی ضرورت بھی ایک حد تک ہی ہو سکتی ہے۔

یہاں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بے جا نہ ہو گا کہ ملک میں تعلیمی سہولیات کی کمی کی وجہ سے حتیٰ کہ ابتدائی تعلیم کے خاطر خواہ انتظامات نہ ہونے کی بنا پر گذشتہ چند سالوں کے دوران بڑے شہروں، قصبوں اور دیہاتی علاقوں تک میں پرائیویٹ سکولوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔

محلہ محلہ گلی گلی آپ کو ان غیر سرکاری سکولوں کے سائن بورڈ نظر آئیں گے۔ انہیں پبلک سکول، ماڈل سکول، ماڈرن سکول اور گرامر سکول وغیرہ کے خوبصورت ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان سکولوں میں طلبہ سے بھاری فیسیں وصول کی جاتی ہیں۔ ضرورت مند والدین یہ فیسیں دینے پر مجبور ہیں اور اس قسم کے سکول چلانے والے دنوں میں اچھے خاصے سرمایہ دار بن جاتے ہیں۔ الغرض تعلیم ایک انتہائی منفعت بخش کاروبار بن کر رہ گئی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان سکولوں سے بھی صرف متوسط اور بالائی طبقوں کے لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جبکہ ملک کی کثیر مفلوک الحال آبادی ان سکولوں کی بھاری فیس کا بوجھ اٹھانے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے بچے تعلیم سے محروم ہیں۔

برصغیر کے ممالک جن میں ہمارا پڑوسی پاکستان بھی شامل ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے ساٹھ سال بعد تک بھی ان مسائل سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ ایک طرف اتنے اعلیٰ تعلیمی ادارے موجود ہیں کہ ان میں داخل ہوں تو محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کسی یورپی ترقی یافتہ ملک میں آ گئے ہیں جبکہ دوسری طرف سرکاری اداروں میں نادار بچوں کو بیٹھنے کیلئے ٹاٹ بھی میسر نہیں ہوتے۔ نظامِ تعلیم میں اس بھیانک تضاد کی وجہ معلوم کرنے کیلئے روزنامہ جنگ نے پاکستان کے مختلف ماہرینِ تعلیم سے ان کی رائے دریافت کی:

"ادارۂ تعلیم و تحقیق کے استاد ڈاکٹر عبدالحمید نے کہا کہ یہ مفروضہ غلط

ہے کہ صرف امیر گھرانوں کے بچے ہی زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ ذہانت کا تعلق بچے کے والدین کی معاشی آسودگی سے ہرگز نہیں ہوتا۔ ذہانت خداداد چیز ہے۔ لیکن اعلیٰ سرکاری عہدوں پر پہنچنے کیلئے انگریزی سکولوں میں تعلیم حاصل کرنا اس لیے معاون ثابت ہوتا ہے کہ ان سکولوں کا سماجی ماحول، عام گفتگو میں استعمال کی جانے والی اصطلاحات اور اسلوب وہ بنیادی عوامل ہیں جو ان سکولوں سے فارغ ہونے والے بچوں کو عام بچوں کے مقابلے میں غیر حقیقی طور پر ممتاز کر دیتے ہیں۔ اس طبقاتی نظام تعلیم کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک کے وسائل بہت کم اور آبادی بہت زیادہ ہے۔ اس لئے یہاں عام اور مساوی تعلیم کی فراہمی نہایت مشکل کام ہے۔"

"پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغیات کے استاد پروفیسر مہدی حسن سے رائے لی گئی تو انہوں نے بتایا کہ میں نظریاتی طور پر طبقاتی معاشرے کے ہی خلاف ہوں جس میں طبقاتی نظامِ تعلیم بھی شامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا نظامِ تعلیم دیگر نظاموں کی طرح دورِ غلامی کی یادگار ہے اور ہم نے اسے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ تمام تعلیمی پالیسیاں اس لئے ناکام ہوتی رہی ہیں کہ اول تو پالیسی سازی کا کام بیورکریسی کرتی ہے اور اساتذہ سے ان ضمن میں کوئی مشورہ نہیں لیا جاتا۔ دوسرے یہ کہ آپ معاشرے میں جزیرے قائم نہیں کر سکتے۔ آپ کو پورے معاشرے کو بدلنا ہو گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ طبقاتی معاشرے میں اہلیت سے زیادہ انسان کا طبقہ اہمیت رکھتا ہے اور ہمارے ملک میں عام طور پر کلرک کا بیٹا کلرک اور مزدور کا بیٹا مزدور ہی بنتا ہے کیونکہ وسائل صرف چند فی صد اہلِ ثروت لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ مہدی حسن صاحب نے کہا کہ تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ سچ کو تلاش کیا جائے اور منطقی سوچ پیدا ہو لیکن یہاں جو تعلیم دی جا رہی ہے اس میں نہ سچ بولنا شامل ہے اور نہ سوچ کی عادت

حکومت بدل جانے سے یہ سلسلہ بھی سیاست کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔
اور آج کل اس ادارے سے تعلق رکھنے والے ہزاروں اساتذہ
بیروزگاری سے دوچار ہیں۔"

(درج بالا تمام اعداد و شمار 21 جولائی 1989ء کو ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے
پروفیسر لیئق احمد کے ایک تعلیمی پروگرام سے لئے گئے ہیں۔)

جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کا تعلق ہے۔ صورت حال کچھ مختلف نہیں ہے۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کے زیر تسلط کشمیر میں شرح خواندگی 36.67 فیصد تھی۔ جس میں سے مردوں کی شرح 36 فیصد اور عورتوں کی 16 فیصد تھی۔ آزاد کشمیر میں 1981ء کی مردم شماری کے مطابق شرح خواندگی 25.66 فیصد تھی۔ جس میں سے مردوں کا تناسب 40 فیصد اور عورتوں کا صرف 10.08 فیصد تھا۔

اب ہم ان اعداد و شمار کا تقابل دنیا کے بعض دوسرے ممالک سے کریں گے۔ تاکہ اپنی تعلیمی پسماندگی کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہ اعداد و شمار ترقی یافتہ نہیں بلکہ ترقی پذیر ممالک کے ہیں۔

ملک	شرح خواندگی
قبرص	99فیصد
کیوبا	98فیصد
برونائی	98فیصد
ماریشس	94فیصد
جنوبی کوریا	94فیصد
اینٹی گوا	90فیصد
اسرائیل	88فیصد
سری لنکا	84فیصد
ملائیشیا	85فیصد
لبنان	75فیصد
البانیہ	75فیصد

کویت	71فیصد
اردن	71فیصد
ترکی	70فیصد
چین	70فیصد
عراق	70فیصد
برما	66فیصد
سری نام	60فیصد
لیبیا	60فیصد

بحر ہند میں ماریشس ایک چھوٹا ملک ہے۔ جس کی کل آبادی دس لاکھ ہے۔ اس ملک کی معیشت کا دارومدار صرف زراعت پر ہے اور ان کی واحد پیداوار "گنا" ہے۔ چند سال قبل یہاں گنے کی پیداوار ساڑھے سات لاکھ ٹن تھی جو مسلسل بڑھ رہی ہے۔ یہاں کے منصوبہ سازوں نے اپنا ہدف دس لاکھ ٹن مقرر کر رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے جس روز ہم ایک ٹن فی کس یعنی دس لاکھ ٹن گنے کا ہدف پورا کرلیں گے، اس روز ماریشس خوشحالی کے دور میں داخل ہو جائے گا۔ ماریشس کی ساری زندگی گنے کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہاں کی زراعت، صنعت اور تجارت پر گنا اور اس کی پیداوار چھائی ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہاں کے تعلیمی اداروں میں بھی ہر شعبے کا محور گنا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا ان کی قومی ضروریات کا اولین تقاضا ہے۔

اگر یہاں یعنی کشمیر میں ایک زرعی یونیورسٹی قائم کی جائے تو اس کیلئے گنے اور کپاس کو اپنا موضوع بنانا تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اس کے برعکس یہاں ایسے مضامین اختیار کرنے ہوں گے اور ان مضامین کی تعلیم و تحقیق کا کام کرنا ہوگا جن کی اس ملک کو ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ہارٹی کلچر، ملبری کلچر Goat farming & sheep farming یعنی بھیڑ بکریاں پالنے کے فارم، Cattle Farming یعنی مویشی پالنے کے فارم، Mushroom farming یعنی کھمبیاں پیدا کرنے اور محفوظ کرنے کے فارم وغیرہ علیٰ ہذا القیاس یہی اصول جیالوجی اور دیگر مضامین پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

ڈالنا، نہ ہم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تعصب سے پاک ہوتے ہیں۔"

ایچی سن کالج لاہور کے پرنسپل عبدالرحمٰن قریشی سے پوچھا گیا کہ آپ کو غریب طالب علموں اور امیر طالب علموں کا الگ الگ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنا کیسا لگتا ہے۔ تو انہوں نے تسلیم کیا کہ یہ طبقاتی تقسیم ہر لحاظ سے نامناسب ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ایچی سن کالج کے طرز تعلیم میں قائدانہ صلاحیتوں کے ابھرنے کی گنجائش زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف سیاست اور فوج بلکہ ہر شعبے میں اس ادارے کے فارغ التحصیل طلبہ آپ کو نمایاں نظر آسکتے ہیں۔"

(جنگ میگزین 23 تا 29 جون 1989ء)

"آزادی کے ساٹھ سال گزر جانے کے باوجود برصغیر کے ممالک کی تعلیمی صورت حال انتہائی مایوس کن ہے۔ بطور مثال ہم پاکستان کے تعلیمی اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1951ء میں پاکستان میں دس سال سے زیادہ عمر کے ناخواندہ افراد کی تعداد 20 ملین (دو کروڑ) تھی۔ 1961ء میں یہ تعداد بڑھ کر 22 ملین (2 کروڑ 20 لاکھ) ہوگئی۔ 1972ء میں یہ تعداد 34 ملین (3 کروڑ 4 لاکھ) اور 1981ء میں 42 ملین (4 کروڑ 20 لاکھ) تک پہنچ گئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آبادی میں تیزی سے ہونے والے اضافہ کے مقابلے میں خواندگی کی شرح میں بہت معمولی اضافہ ہوتا رہا۔ اس لئے ناخواندہ افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

اس وقت پاکستان میں خواندگی کی شرح صرف 26.2 فیصد ہے۔ یعنی سو میں سے 74 افراد ان پڑھ ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ خواندگی کا معیار مردم شماری میں یہ مقرر کیا گیا ہے کہ جو لوگ ناظرہ قرآن شریف یا اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ انہیں پڑھا لکھا شمار کیا جاتا ہے۔ جبکہ اقوامِ متحدہ کے ادارہ

یونیسکو UNESCO نے پڑھا لکھا ہونے کا یہ معیار مقرر کیا ہوا ہے کہ بچہ کم از کم تیرہ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرتا رہا ہو۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کم سے کم مڈل پاس ہو۔ اگر اس معیار سے دیکھا جائے تو خواندگی کی شرح دس فی صد سے بھی کم رہ جائے گی۔

ملکی سطح پر تو خواندگی کی شرح 26.2 فی صد ہے لیکن صوبہ جاتی سطح پر صورتحال اس طرح ہے:

سندھ	31.2 فیصد
پنجاب	27.3 فیصد
سرحد	17.3 فیصد
بلوچستان	10.9 فیصد

اس طرح دیہاتی علاقوں میں شرح خواندگی بہت ہی کم ہے۔ ملکی سطح پر شہری آبادی میں خواندگی کی شرح 47.4 فیصد ہے جبکہ دیہی علاقوں میں یہ شرح صرف 17.2 فیصد ہے۔ اسی طرح مردوں اور عورتوں کی شرح خواندگی میں بڑا فرق ہے۔ مردوں کی شرح خواندگی 36 فیصد ہے جبکہ اس کے مقابلے میں عورتوں کی شرح صرف 15.2 فیصد ہے۔

عورتوں کا صوبہ وار تناسب حسب ذیل ہے۔

پنجاب	18.6 فیصد
سرحد	7.2 فیصد
سندھ	4.2 فیصد
بلوچستان	2.0 فیصد

چند سال قبل محمد خان جونیجو کے دور حکومت میں لیمک LAMEC کے نام سے تعلیم بالغان کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ لیکن گزشتہ سال

ہفت روزہ میگ (MAG) کراچی میں انسانی بہبود کے شعبہ میں ترقی کی پیش رفت کے بارے میں جاوید اے ملک کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں اعداد وشمار کے حوالہ سے بتایا گیا تھا کہ انسانی بہبود (Human Development) کے معاملے میں پاکستان دنیا کے 160 ممالک میں سے 120 ویں نمبر پر ہے۔ اس مضمون میں جو تقابلی گوشوارہ دیا گیا ہے اس کے چیدہ چیدہ حقائق حسب ذیل ہیں۔

	پاکستان	جنوبی ایشیا کے ممالک	ترقی پذیر ممالک	ترقی یافتہ ممالک
متوقع اوسط عمر (سال)	57.7	58.4	62.8	74.5
اوسط قومی آمدنی فی کس سالانہ (ڈالر)	350	388	706	125.8
بالغوں میں خواندگی کا تناسب (فیصد)	31	42	60	99
تعلیم پر خرچ قومی آمدنی کا (فیصد)	2.2	3.4	3.7	5.2
صحت پر خرچ قومی آمدنی (فیصد)	0.2	1.0	1.4	4.7
مسلح افواج پر خرچ	6.7	7.2	5.5	5.4

(Human Development indicatios of Pakistan from human development report 1992)

درج بالا گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم وصحت کے مقابلہ میں فوج پر تناسب صرف 5.4 فیصد ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں 1.9 فیصد، جنوبی ایشیا کے ممالک میں 64 فیصد اور غریب ملک پاکستان میں فوج پر تعلیم وصحت کے مقابلہ میں 27.9 فیصد خرچ کیا جاتا ہے۔

یہ صورت حال انتہائی مایوس کن ہے۔ حصول آزادی کے 60 سال بعد بھی عوام الناس غربت، جہالت، پس ماندگی اور محرومی کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آزادی کے بعد اقتدار پر مٹھی بھر استحصالی طبقہ قابض ہو گیا ہے اور عوام الناس کی معاشی آزادی وخوشحالی کی منزل ابھی بہت دور ہے۔



علاج معالجے کی آزادی

کیا آپ نے کبھی کسی سرکاری ہسپتال کے بیرونی مریضوں کے شعبہ میں علاج کیلئے آنے والے مریضوں کی حالت زار دیکھی ہے؟

ہر بیماری کے شعبہ میں پرچی بنانے والے کے گرد لوگوں کی دھکم پیل، لوگوں کا ہجوم اور آخر یہ جواب کہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ دواؤں میں سے بیشتر بازار سے خریدنا پڑیں گی۔ لوگوں کی بے بسی اور بے کسی قابل دید ہوتی ہے۔ مفلسی اور بیروزگاری کے مارے ہوئے غریب عوام کیلئے یہ سب جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔

اب ایک اور پہلو پر نظر ڈالیے۔

شہروں اور قصبوں میں جگہ جگہ پرائیوٹ کلینک اور ہسپتال کھلتے جا رہے ہیں۔ صاحب استطاعت لوگ انہی علاج گاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں ان سے ڈاکٹر کی تعلیمی حیثیت کے مطابق معائنہ فیس اور اس کے بعد مختلف قسم کے معائنوں کی فیس (جن میں ایکسرے، ای سی جی، الٹراسونوگرافی سٹول، بلڈ، یورین وغیرہ شامل ہیں) وصول کی جاتی ہے اور پھر دوائیں بازار سے ہوشربا حد تک گراں قیمتوں پر حاصل کرنا پڑتی ہیں۔ بعض اوقات مریضوں کو اپنی جائیدادیں بیچ کر اور قرضے اٹھا کر علاج کرانا پڑتا ہے۔ پھر بھی صحت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ایک بار جنرل ضیاء الحق نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں پرائیوٹ پریکٹس کرنے والے ڈاکٹر شام کو کلینک بند ہونے کے وقت بوریوں میں نوٹ بھر کر لے جاتے ہیں۔ ضیاء الحق نے یہ بات مذاق میں کہی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ پرائیوٹ پریکٹس کرنے والے ڈاکٹروں کا شمار بھی اب سرمایہ داروں میں ہونے لگا ہے۔ یوں علم کی طرح طب بھی ایک منافع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ کیا یہ آزادی ہے؟ ہرگز نہیں، ایک آزاد مملکت کے فرائض میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ اپنے عام شہریوں کیلئے بلا امتیاز علاج معالجے کا مکمل بندوبست کرے۔

چند برس قبل صدر آزاد کشمیر سردار عبدالقیوم خان کا ایک بیٹا کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا چنانچہ اس کے علاج کیلئے آزاد کشمیر کے خزانے سے کئی لاکھ روپے منظور کروائے گئے۔ صدر صاحب خود اسے برطانیہ لے کر گئے اور وہاں سے مکمل علاج کے بعد تندرست ہو کر وطن واپس آ گئے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سردار صاحب کو صدر مملکت ہونے کی وجہ سے یہ مراعات حاصل ہوں گی کہ ان کے اہل خاندان کے علاج معالجہ کیلئے خزانہ عامرہ سے حسب ضرورت رقوم خرچ کی جائیں گی۔ لیکن اگر ملک کا عام شہری، کوئی مزدور، کسان یا دکاندار ایسی کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو کیا حکومت اس کیلئے بھی اس قسم کی سہولیات بہم پہنچائے گی؟

اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ابھی آزادی کی منزل سے بہت دور ہیں۔ ایک آزاد ریاست میں تمام شہری برابر ہوتے ہیں اور ہر شہری کے روزگار اور تعلیم کے ساتھ ساتھ صحت اور تندرستی کی حفاظت اور علاج معالجے کا مفت بندوبست ریاست کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں حکومت کے بعض محکموں اور بعض نیم سرکاری اداروں اور کارپوریشنوں میں ملازمین کے علاج کی سہولتیں Medical Facilities فراہم کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک فوجی بیمار ہو جائے تو سرکاری فوجی ہسپتال میں اس کے علاج اور خورد ونوش کا مکمل انتظام ہوتا ہے۔ اسی طرح بنک کے ملازمین کو علاج معالجے کے اخراجات بنک کی طرف سے دیئے جاتے ہیں۔ لیکن دیگر شہریوں کو اس قسم کی سہولتیں دستیاب نہیں حالانکہ کھیت میں کام کرنے والا کسان، بنک کا کوئی ملازم، فیکٹری میں کام کرنے والا مزدور اور سرحدوں کی حفاظت کرنے والا سپاہی سبھی اپنی اپنی جگہ اہم فرائض سرانجام دے رہے ہوتے ہیں اور سب ایک سی سہولیات کے مستحق ہیں۔ آیئے ایک بار پھر ایک نو آزاد ملک لیبیا کی طرف چلتے ہیں۔

پاکستان کے نامور صحافی ارشاد احمد حقانی اپنے ایک سفرنامے میں رقم طراز ہیں:

''ملک (لیبیا) میں طبی سہولتیں یکسر مفت ہیں۔ طبی سہولتوں کا معیار انتہائی بلند اور اطمینان بخش ہے..... مجھے پاکستانی ڈاکٹروں نے بتایا کہ ایسی سہولتیں دنیا میں بہت کم ممالک میں میسر ہوں گی۔ طب کے ہر شعبے کیلئے

ماہرین موجود ہیں، علیحدہ ہسپتال ہیں، کسی بھی مریض کو دوسرے کسی شہر میں واقع ہسپتال میں دکھانے کی ضرورت ہو تو فوری طور پر اسے وہاں پہنچایا جائے گا۔ ایمرجنسی کیسوں میں ہیلی کوپٹر بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور قطعاً کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ تیل کی آمدنی میں حالیہ کمی سے پہلے تک یہ حالت تھی کہ اگر کسی مریض کا علاج بیرون ملک ناگزیر ہو تو عام شہری کے جملہ اخراجات بھی حکومت برداشت کرتی تھی اور اسے ایک تیماردار بھی اپنے ساتھ سرکاری طور پر لے جانے کی اجازت تھی اور ایسی منظوری فراخدلی سے دی جاتی تھی۔ اس وقت ایسی ضرورت پیش آنے پر مریض کو مشرقی یورپ میں بھیجا جاتا ہے کیونکہ وہاں پر علاج کے اخراجات قدرے کم ہیں۔

مجھے ایک پاکستانی نے جو عارضی طور پر وہاں مقیم ہے۔ بتایا کہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ پورے کیس پر اس کی ایک پائی تک نہیں خرچ ہوئی۔ ملک میں ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بچوں کے امراض کا ہسپتال طرابلس میں الگ ہے۔ زچہ و بچہ کا ہسپتال علیحدہ ہے۔ اور میو ہسپتال لاہور کی طرز کا ایک جنرل ہسپتال بھی موجود ہے، مفت طبی امداد کا نظام نہایت تسلی بخش ہے۔''

(روزنامہ "جنگ لاہور" 19 مارچ 1987ء)

اب ہم آپ کو تیسری دنیا کے ایک اور اسلامی ملک الجزائر لے چلتے ہیں۔ اس ملک نے طویل جدوجہد کے بعد 1963ء میں فرانس سے آزادی حاصل کی ہے اور اب تک ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اپنی اندرونی تعمیر وترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے اور پسماندگی کی عمیق گہرائیوں سے نکل کر اقوام عالم میں مہذب ممالک کی صف میں آنے کیلئے جدوجہد کر رہا ہے۔

چند سال قبل الجزائر کے وزیر صحت ڈاکٹر جمال نے صحت کے میدان میں انقلابی پروگرام کا آغاز کیا۔ انہوں نے ''پرہیز علاج سے بہتر ہے'' Prevention is better than cure کے اصول کو عملی صورت دینے کیلئے ایک منصوبہ کے تحت ملک گیر مہم شروع کی۔ اس منصوبے کے تحت

گاؤں کے نمبرداروں، اساتذہ، پیرامیڈیکل سٹاف اور مساجد کے اماموں کے تعاون سے بیماریوں کو پیدا ہونے سے روکنے کیلئے احتیاطی تدابیر پر عمل شروع کیا گیا۔ اس مہم میں وزیر موصوف کو ڈاکٹروں اور ادویات کی تجارت سے منسلک افراد کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن انہیں صدر شاذلی بن جدید کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ ڈاکٹر جمال نے میڈیکل کالجوں میں طب کے نصاب کو بدل کر رکھ دیا اور اب وہاں پرہیزی طریقہ علاج اور حفظان صحت کے طریقوں پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔

الجزائر کافی عرصہ تک فرانس کی نوآبادی رہا ہے اور احمد بن بیلا کی قیادت میں جنگ لڑ کر آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوا ہے۔ آج جو ڈاکٹر حضرات نئے نظام کی مخالفت کر رہے ہیں وہ فرانس کے طبی نظام کے تربیت یافتہ ہیں۔ ڈاکٹر جمال نے ایک فرانسیسی اخبار نویس کو انٹرویو دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا ”فرانس کا طبی نظام الجزائر کیلئے تباہ کن ہے۔“ انہوں نے کہا

> ہم نے نوآبادیاتی دور میں تم لوگوں کے طور طریقوں کی نقل تو کر لی لیکن یہ کبھی نہیں سوچا کہ ان کا الجزائر کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارے ملک کی آبادی بوڑھی ہو کر ہسپتالوں میں جا رہی ہے۔ لیکن میرے ملک کی تہتر (73) فیصد آبادی پچاس سال سے کم عمر کی ہے۔ میں انہیں ہسپتالوں میں نہیں لے جانا چاہتا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے گھروں میں رہیں اور تندرست رہیں۔“

عالمی ادارہ یونیسیف Unicef کے ایک ڈپٹی ڈائریکٹر ورنیدر راوناچی نے الجزائر کے اس انقلابی قدم کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اقدام غیر معمولی نوعیت کا ہے اور الجزائر نے ”پرہیز علاج سے بہتر ہے“ کے مقولے کو سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ ورنیدر راوناچی نے لکھا ہے کہ ”ڈاکٹروں کو لوگوں کی صحت کا محافظ ہونا چاہیے نہ کہ دوائیوں کا ڈسپنسر۔“

(ماہنامہ ”حکایت“ اکتوبر 1987ء)



آزادیٔ ضمیر۔ مذہبی آزادی

ادارہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی منشور کو دنیا کے تمام ممالک نے منظور کر رکھا ہے۔ اس منشور کی دفعہ 18 میں کہا گیا ہے کہ:

> ”ہر انسان کو آزادیٔ فکر، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر تنہا یا دوستوں کے ساتھ مل کر عقیدے کو تبدیل کرنے، تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔“

دنیا کے بھی آزاد ممالک نے اپنے دساتیر میں اس آزادی کو تسلیم کیا ہوا ہے اور اس کی ضمانت دی ہے۔ مثال کے طور پر سویت یونین کے دستور کی دفعہ نمبر 124 کے تحت تمام شہریوں کو مذہبی آزادی دی گئی ہے۔ مذہب کے ماننے والوں کو مجالس کی تشکیل، مذہبی عبادات، مذہبی مدرسے کھولنے اور مذہبی کتابیں شائع کرنے کی آزادی ہے۔ البتہ مذہب کو سیاسی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایات بھی ہیں کہ مذہب کے خلاف پروپیگنڈا میں مذاہب کے ماننے والوں کے مذہبی جذبات یا مذہبی لوگوں اور پادریوں کی توہین نہ کی جائے۔ اسی طرح عوامی جمہوریہ چین کے آئین کی دفعہ 28 میں کسی بھی مذہب کو ماننے یا نہ ماننے کی آزادی دی گئی ہے اور اس پر وہاں عمل بھی ہو رہا ہے۔ جس کا ثبوت چینی مسلمانوں کے وہ حج وفود ہیں جو ہر سال پاکستان کے راستے فریضہ حج ادا کرنے کیلئے جاتے ہیں۔ بعض قارئین کیلئے یہ بات باعثِ حیرت ہوگی کہ سوویت روس میں ہر سال مختلف زبانوں میں اسلامی علوم پر کثیر تعداد میں نہایت اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ہم نے دو کمیونسٹ ممالک کی مثال اس لئے دی ہے کہ عام طور پر یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ کمیونسٹ ممالک میں مذاہب پر مکمل پابندی لگائی گئی ہے۔

گذشتہ باب میں ہم سرسید احمد خان کے حوالے سے ذکر کر چکے ہیں کہ ان کی نظر میں ”لوگوں

کی بدقسمتی کی وجہ دنیاوی مسائل کو مذہبی مسائل سے الجھاتا ہے۔ ان کے مطابق دنیاوی مسائل سے مذہبی مسائل کو ملانا پاگل پن ہے، مذہبی افکار سماجی ضروریات سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ سماجی حالات، ثقافت اور تہذیبی ضروریات بدلتی ہیں اس لئے نہ ہی ان کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ ان کو احکام مذاہب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔"

(ہفت روزہ "دوست" 28 نومبر 1989ء صفحہ 16-17)

اب ہم ذرا اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اسلام کا اس بارے میں کیا نکتہ نظر ہے۔ اس سلسلے میں قرآن وحدیث میں واضح احکامات موجود ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے: لا اکراہ فی الدین یعنی دین کے معاملہ میں کوئی جبر واکراہ روا نہیں ہے۔ ہر شخص کی اپنی مرضی ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ اسی طرح قرآن پاک سورۃ الکافرون میں کافروں سے مخاطب ہو کر فرمایا گیا ہے کہ

"اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی عبادت تم کرتے ہو، نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کو تم پوجتے ہو...... تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔"

رسول اکرم ﷺ کی یہ حدیث تو بہت معروف ہے کہ

"اگر تم دوسروں کے خداؤں کو برا کہو گے تو دوسرے تمہارے خداؤں کو برا کہیں گے۔"

جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام لوگوں کو دوسرے مذاہب کے عقائد کا احترام کرنا چاہیے۔ اسلام نے دین کے معاملے میں رواداری کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلے میں اس معاہدے کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو آنحضرت نے مدینہ کے غیر مسلموں کے ساتھ کیا تھا اور میثاق مدینہ کے نام سے تواریخ میں موجود ہے۔ اس میثاق میں علاوہ اور باتوں کے یہ بات بھی تسلیم کی گئی اور اس کی ضمانت دی گئی کہ:

"یہود جو ہماری حکومتِ اسلام سے تعلق رکھتے ہیں تمام ذلتوں اور اذیتوں سے بچائے جائیں گے اور ہماری امت کے ساتھ انہیں مساوی حقوق

حاصل ہو گے۔ یہودان بنی عوف، بنی نجار، بنی حارث، بنی جشم، بنی غالب، بنی اوس اور سب ساکنان یثرب مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم سمجھے جائیں گے اور وہ اپنے اعمال مذہبی کو ایسی ہی آزادی کے ساتھ بجا لائیں گے جیسے مسلمان اپنی رسومات دینی کو ادا کرتے ہیں۔"

(سوانح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ از ریاض حسین شہر صفحہ 7)

گویا مذہبی لحاظ سے تو غیر مسلم اہل یثرب کو مکمل آزادی دی گئی اور ساتھ ہی سیاسی معاملات میں انہیں اپنی قوم کا حصہ قرار دیا گیا۔ اسی میثاق میں یہ شق بھی درج ہے کہ یہود کے دشمنوں کو مسلمان اپنا دشمن اور ان کے دوستوں کو اپنا دوست تصور کریں۔ اسی طرح یہودی بھی مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنا دشمن اور انکے دوستوں کو اپنا دوست سمجھیں۔

اس واضح اور غیر مبہم موقف کو مدِ نظر رکھئے تو سر سید احمد خان کے اس نکتہ نظر میں وزن دکھائی دیتا ہے کہ کسی بھی ملک کے رہنے والوں کے مختلف عقائد اور مذہبی افکار میں اختلاف تو ہو سکتا ہے جبکہ ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی ملک اگر معاشی بدحالی بے کاری، بے روزگاری اور تعلیمی پس ماندگی کا شکار ہو تو اس کا اثر اس ملک کے سبھی باشندوں پر بلا لحاظ مذہب وملت ہوگا اور ان سب کو مل جل کر ہی اس کا حل ڈھونڈنا پڑے گا۔ 1946ء میں بنگال میں قحط پڑا تو اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی۔ مغربی ممالک میں جب بعض اوقات کالے لوگوں میں منافرت کی کوئی لہر چل پڑتی ہے تو اس کا شکار ہونے والے کالے از خود ہی آپس میں متحد ہو جاتے ہیں اور اس لہر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ ہم لوگ کس کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی کیمونٹی کا تحفظ ان کا مشترک مقصد ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ کسی بھی ملک کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کیلئے اس ملک کے تمام باشندوں میں اتحاد و یگانگت لازمی شے ہے۔ ان معاملات میں مذہبی تفریق تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک آزاد ملک میں تمام باشندوں کو یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ وہ بلا روک ٹوک اپنے مذہبی شعائر ادا کر سکیں۔ اس معاملے میں کسی ایک فرقے کا دوسرے فرقے پر زور یا جبر آزادئ ضمیر کے منافی ہے۔ کسی بھی ملک کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کا اپنے ملک پر اتنا ہی حق ہوتا ہے جتنا بڑی سے

بڑی اکثریت کا۔ آج اگر ہندوستان میں جن سنگھ اور شیوسینا جیسی فرقہ پرست تنظیمیں یہ نعرے لگا رہی ہیں کہ مسلمانوں کو یہ ملک چھوڑ کر چلا جانا چاہیے تو اس رویے کو پاگل پن کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان مسلمانوں نے اسی مٹی سے جنم لیا ہے اور اس ملک پر ان کا بھی اتنا ہی حق جتنا دوسروں کا۔ یہی مثال کشمیر کے ان عاقبت نااندیش عناصر پر صادق آتی ہے جو غالب اکثریت میں ہونے کے باوجود اپنے ہی ماں جائے بھائیوں سے ارض وطن کو محض اس لیے خالی کرانا چاہتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلغاریہ کی حکومت نے اسی قسم کی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمان اقلیت پر پابندی لگا دی تھی۔ جس کے نتیجے میں 1.5 لاکھ کے قریب مسلمان ترک وطن کر کے ترکی جانے پر مجبور ہو گئے۔ کسی داخلی اور عالمی دباؤ کے تحت حکومت بلغاریہ کو اپنی غلطی کا احساس کرنا پڑا اور ان تمام مسلمانوں کو واپس لانے کے انتظامات کیے گئے۔

ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جموں کشمیر میں جب بھی مذہبی آزادیوں پر قدغنیں لگیں، جب بھی مذہبی منافرت اور فرقہ پرستی نے سر ابھارا، اس کے نتائج تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلے۔ چار صدیوں قبل جب ہماری غلامی کا آغاز ہوا اس وقت بھی ہندوستان کا فرمانروا اکبر اعظم کشمیر کو زیر تسلط لانے میں اس لئے کامیاب ہوا کہ یہاں کے عوام شیعہ سنی مناقشت میں مبتلا ہو گئے تھے اور ایک فرقے کے علماء کا وفد یہ درخواست لے کر دلی دربار میں حاضر ہو گیا تھا کہ حضور، آیئے اور دوسرے فرقے کے جابر حکمران سے نجات دلا کر ہمیں اپنی قلمرو میں شامل کر لیں۔ اس سے قبل مغل افواج آٹھ مرتبہ کشمیر کو تسخیر کرنے کی کوشش کر چکی تھیں لیکن کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ لیکن جب عوام کے ایک طبقے نے بیرونی جارحیت کو خود ہی دعوت دی تو ان کی کامیابی کیلئے میدان خود ہی صاف ہو گیا۔ اس کے بعد تاریخ میں کئی ایسے شواہد ملتے ہیں کہ حکمرانوں نے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کیلئے کبھی شیعوں سنیوں کو آپس میں لڑا دیا کبھی ہندو مسلم فسادات کرا دیئے۔ ان تفصیلات میں جانے کا یہ موقع محل نہیں ہے۔ لیکن ہم عصر تاریخ سے ایک ننگ انسانیت واقعہ کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔

پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاالحق نے ریاست جموں کشمیر کے شمالی علاقوں کو پاکستان کا حصہ قرار دے ڈالا۔ آزاد کشمیر کی تمام سیاسی جماعتوں اور خود گلگت بلتستان کے عوام کے ایک طبقہ نے اس کی شدید مخالفت کی کیونکہ یہ قدم ریاست جموں کشمیر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے مترادف

تھا۔ لیکن صدر ضیاء کی حکومت اس منصوبے پر قدم آگے بڑھاتی رہی۔ یہاں تک کہ ان علاقوں کو پاکستان کا صوبہ بنانے کی باتیں ہونے لگیں۔ اسی دوران یہ "خدشہ" سامنے آیا کہ اگر ان علاقوں کو ایک صوبے کی شکل دی گئی تو یہ شیعہ اکثریت کا صوبہ ہوگا۔ اسلامی نظام کا دعویٰ کرنے والوں کو یہ گوارہ نہ تھا۔ پھر 1988ء میں یہاں ایک ایسا خونیں ڈرامہ کھیلا گیا جس کی تفصیلات سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ حکومت نے ان تفصیلات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن حقائق رفتہ رفتہ سامنے آ ہی گئے۔ ماہنامہ "ضمیر" لاہور نے اس واقعہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ چند اقتباس یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"18 مئی 1988ء کو امریکی اسلحے سے لیس افغان مجاہدین کا چالیس ہزار کا لشکر فرقہ ورانہ تصادم کے بہانے گلگت پر حملہ آور ہوا۔ یہ لشکر دیر، سوات، اور انڈس کوہستان لنک سے فوجی کارروائی کی طرز پر حملہ آور ہوا۔ گلگت کے پہلے گاؤں سکوار پر حملہ کیا گیا جو پاکستان کی فوجی چھاؤنی سے آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ شمالی علاقے کا فوجی کمانڈر اپنے محل نما بنگلے میں تماشائی کے طور پر بیٹھا رہا۔"

"افغان لشکر نے متواتر پانچ دن تک قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کئے رکھا۔ تقریباً 1200 گھر تباہ کر دیئے گئے مگر حکومت پاکستان کی جانب سے کسی نے انہیں روکنے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس واردات کے بعد وہ بکھر گئے اور لشکر کا ایک حصہ دریائے سندھ عبور کر کے سکردو سیاچن کی طرف چلا گیا۔ تمام دیہات جنہیں لوٹ مار اور قتل و غارت کا نشانہ بنایا گیا وہ شیعہ مسلمانوں کے تھے۔"

"یہ خبر ان فوجیوں تک پہنچی جو 90 فیصد مقامی لوگ ہیں مگر افسر پنجابی اور پٹھان ہیں اور جو سیاچن اور اس سے ملحقہ محاذ پر دفاعی کارروائیوں میں مشغول ہیں۔ ان میں اس قدر بددلی پھیلی کہ بغاوت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ حملہ آوروں سے درخواست کی گئی کہ وہ از راہ کرم واپس چلے جائیں۔ واپسی کے لئے انہیں تمام سہولتیں مہیا کی گئیں۔ انہیں خوش

کرنے کیلئے پیسے بھی دیئے گئے کیونکہ وہ ”مجاہد“ جو ٹھہرے اور انہوں نے ”کافروں“ کے خلاف ”جہاد“ جو کیا تھا۔ یہ ”کافر“ جو شمالی علاقے کے باشندے ہیں۔ خاص طور پر شیعہ مسلم جو آبادی کا 65 فیصد حصہ ہیں۔“

”یہ سارا خونیں ڈرامہ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی زیر نگرانی کھیلا گیا......

گلگت میں جو قتل و غارت ہوئی اس کے نتیجے میں بھائی بھائی سے الگ ہو چکا ہے۔ سنی شیعہ اور آغا خانی کی تفریق انتہا پر ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ خونریز تنازعہ کب ختم ہوگا۔ تینوں فرقے خود کو مسلح کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کا اسلحہ خریدا جا رہا ہے اور اسی قسم کے متوقع حملے کے مقابلہ کرنے کیلئے ضروری تربیت حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔“

(ماہنامہ ”ضمیر“ جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 3، صفحہ 31-32)

فرقہ وارانہ منافرت کا یہ ایک نسبتاً تازہ نمونہ ہے، جس کا بیج حکمران حضرات نے اپنے مخصوص مفادات کیلئے خود بویا اور جس کے اثرات یہاں کے عوام پر دیر تک رہیں گے۔

جب تحریک پاکستان چلی تو اس میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چند سال کے اندر ہی یہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور فرقہ پرستی ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگ جائے گی۔ 1951ء میں پنجاب میں احمدیوں کے خلاف تحریک چلائی گئی جو بظاہر ختم نبوت کے تحفظ کی تحریک تھی لیکن اس کے درپردہ مقاصد کچھ اور تھے۔ سینکڑوں بے گناہ لوگوں کا خون بہا۔ کروڑوں کی املاک تباہ ہو گئیں۔ پاکستان میں پہلے مارشل لاء کا نفاذ اسی تحریک کے نتیجے میں ہوا۔ اس تحریک کے بارے میں حکومت کی طرف سے قائم کئے گئے عدالتی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ میں جسٹس منیر نے لکھا:

”ہزاروں انسان جو عام حالت میں سمجھدار اور عقل مند شہری ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس تحریک میں بے لگام ہجوم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جن کا مقصد مذہب کے نام پر قانون توڑنا اور اس کی خلاف ورزی کرنا تھا اور

ان میں سے کچھ لوگ تو جنگلی جانوروں کی طرح لوگوں کو قتل کر رہے تھے۔ ان کے اثاثوں کو لوٹ رہے تھے اور قیمتی جائیدادوں کو جلا رہے تھے۔ یا تو تماشہ کیلئے یا اپنے خیالی دشمن سے نفرت کے جذبے کے تحت......“

(منیر کمیشن رپورٹ صفحہ 86)

ملکی معاملات میں جب بھی مذہب اور عقیدے کو داخل ہونے دیا جائے گا۔ نتیجہ ہمیشہ یہی ہو گا کیونکہ ہر عقیدے کے لوگ خود کو راہ راست پر اور دوسروں کو گمراہ تصور کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کے جذبات بہت شدید ہوتے ہیں۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کو کافر کہنے سے باز نہیں آتا۔ جسٹس محمد منیر مرحوم اپنی رپورٹ میں فرقہ پرستی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کوئی دو عالم بھی مسلمان کی تعریف پر متفق نہیں ہیں۔ شیعوں کے مطابق تمام سنی کافر ہیں اور اہل قرآن جو احادیث کو غیر مصدقہ سمجھتے ہیں۔ وہ تمام ہی کی نظر میں کافر ہیں اور اسی طرح وہ تمام اہل فکر حضرات بھی جو اپنی فکر اور سوچ رکھتے ہیں۔ نتیجہ نہ شیعہ، نہ سنی، نہ دیوبندی، نہ اہل حدیث، نہ بریلوی ایک دوسرے کے مسلک کے اعتبار سے مسلمان ہیں اور اگر ایک فرقہ کی حکومت قائم ہو جائے تو وہ دوسروں کی گردن اڑا دے“

(منیر کمیشن رپورٹ صفحہ 219)

آج کل پاکستان کے گلی کوچوں میں دیواروں پر ”فقہ جعفریہ نافذ کرو“ ”پاکستان کو سنی سٹیٹ قرار دو“ ”فقہ حنفیہ نافذ کرو“ ”حق چار یار“ اور اسی قسم کے دوسرے نعرے لکھے نظر آتے ہیں جو اس فرقہ پرستی کے زہر کی علامات ہیں جو تنگ نظر مولوی حضرات نے اس قوم کی رگ رگ میں بھر دیا ہے۔

جب ہم آزادی کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کا نقشہ ہونا چاہیے جو ہر قسم کی مذہبی فرقہ پرستی سے پاک ہو جس میں اس ملک کے رہنے والے تمام لوگوں کو مذہبی آزادیاں حاصل ہوں کہ وہ بلا کسی روک ٹوک کے اپنے مذہب پر کاربند رہ کر ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ جہاں مذاہب کو انسانوں کے اندر انتشار اور عداوت کا ذریعہ نہ بننے

دیا جائے۔ ہمیں ایک ایسے ہی پرامن اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل معاشرے کی تعمیر کرنی ہے۔ اسی کا خواب ہمارے رہنماؤں، ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے دیکھا تھا۔ مقبول بٹ شہید سے ان کے آخری انٹرویو میں پوچھا گیا تھا کہ "آپ کس چیز پر یقین رکھتے ہیں؟" تو انہوں نے جواب دیا تھا۔ "بنی نوع انسان کی مساوات، جس میں سماجی انصاف میسر ہو۔" ہمارے عظیم قومی شاعر مجبور نے "نو کشیر" (نیا کشمیر) میں ایسے ہی معاشرے کی نشاندہی کی تھی۔ ہمارے ایک اور وطن دوست شاعر احمد شمیم مرحوم نے بھی خواب دیکھا تھا۔

کفر و دینک قصہ ترأوتھ سینہ تھاؤتھ وارہ صاف

روزہ نا انساں ؤتھ انسان انسانن اندر

یعنی کاش انسان کفر و دین کی باتیں چھوڑ کر اپنے سینے کو تمام کدورتوں سے پاک کر کے انسانوں کے اندر صرف انسان بن کر رہ سکے۔"





RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)

scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF



ریٹائرمنٹ کی آزادی

ہر انسان میں کام کرنے کی استعداد ایک خاص عمر میں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حکومتیں اپنے مختلف محکمہ جات میں کام کرنے والے ملازمین کیلئے ملازمت کی عمر کی ایک حد مقرر کر دیتی ہے۔ جس کے بعد انہیں پنشن دے کر ریٹائرڈ کر دیا جاتا ہے۔ ملازمت کا دورانیہ یا ریٹائرمنٹ کی عمر کام کی نوعیت کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عام سول محکموں کے دفاتر میں کام کرنے والے ملازمین پچپن سال یا ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہو جاتے ہیں جبکہ ہوائی جہاز چلانے والے پائلٹ یا اسی نوع کے دوسرے مشکل اور پُر خطر کام کرنے والے ملازمین کی مدت ملازمت کم ہوتی ہے اور انہیں دوسروں کی نسبت جلد پنشن پر بھیج دیا جاتا ہے۔ مسلح افواج سے تعلق رکھنے والے جوانوں اور افسروں کو بھی ملازمت کی مقررہ معیاد ختم ہونے پر معقول پنشن پر بھیج دیا جاتا ہے۔ بعض ترقی پذیر ممالک میں نیم سرکاری اور بعض غیر سرکاری اداروں کے ملازمین کو بھی پنشن کی سہولت میسر ہوتی ہے۔ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں قابل پنشن Pensionable ملازمتوں کا دائرہ اور بھی وسیع ہوتا ہے۔

لیکن کسی بھی ملک کی آبادی کی محدود تعداد ہی سرکاری یا نیم سرکاری ملازمتوں سے منسلک ہوتی ہے۔ بیشتر آبادی کاشتکاری، دکان داری، پرائیویٹ ملازمتوں اور دیگر ہنر مندانہ پیشوں، مثلاً لوہار، ترکھان، معمار، جولاہے، درزی، دھوبی، حجام اور مزدوری وغیرہ کے پیشوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت ایک آزاد شہری کے ان پیشوں سے وابستہ افراد کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ عمر کی ایک حد کو پہنچ کر اپنے کام سے ریٹائر ہو جائیں اور بقیہ زندگی آرام سے گزاریں۔ ایک معمار یا ترکھان اپنی عمر کے چالیس پچاس سال لوگوں کے مکانات، بڑے بڑے پلازہ، سکول، کالج، ہسپتال اور کارخانے وغیرہ تعمیر کرنے میں گزار دیتا ہے۔ آخر ایک وقت آتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب اس کا مستقبل کیا ہے؟ اگر اس کی کوئی اولاد جوان ہے تو وہ اس کا بوجھ اٹھا لے گی۔ اگر نہیں ہے تو وہ در در کا محتاج ہو کر رہ جائے گا اور

زندگی کے بقیہ ایام عسرت وتنگ دستی میں گزار دے گا۔ زمین کی کوکھ سے اناج پیدا کرنے والا کسان بھی ایک دن بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اسے بھی آرام کی ضرورت ہے لیکن ہمارے موجودہ سماجی اور معاشی ڈھانچے میں ان مسائل کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ بڑے بڑے نامی گرامی فنکار، فلمی ستارے، گلوکار، پہلوان اور کھلاڑی بسا اوقات بڑھاپے کے عالم میں کسمپرسی اور بے کسی کی زندگی گزارتے دیکھے گئے ہیں۔ جب تک ان کے اندر توانائی موجود تھی۔ معاشرہ ان سے مستفید ہوتا رہا۔ جب ان کی عمر ڈھل گئی تو سماج نے انہیں یک سر فراموش کر دیا۔

اکثر ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر اس کا حل کیا ہے؟ ایک کسان یا رنگ ساز یا جفت ساز (شومیکر) کو کہاں سے پینشن مل سکتی ہے۔ وہ تو کسی ادارے کے ملازم نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک آزاد ملک اپنی معیشت کی اس طرح منصوبہ بندی کرتا ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو روزگار ملنے کی ضمانت میسر آئے۔ ملک کی پیداوار پر ملک کے تمام باشندوں کا حق ہو اور ہر شہری کو یہ حق حاصل ہو کہ چاہے وہ کسی بھی پیشے سے وابستہ ہو، بڑھاپے کی عمر میں قدم رکھنے پر ریٹائرمنٹ کے بعد گزر بسر کیلئے اسے معقول پنشن ملے۔ عمر رسیدہ شہریوں کی پنشن آزاد ملک کے بجٹ کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔ بہت سے آزاد ممالک میں ایسا ہو رہا ہے جب اس آزادی کے فوائد بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر فرد کو حاصل ہوں۔ سڑکوں کی تعمیر کیلئے بجری کوٹنے والا مزدور، یخ بستہ پانیوں میں سے علی الصبح مچھلیاں پکڑ کر مارکیٹ تک پہنچانے والا ماہی گیر، زمین کا سینہ چیر کر ہیرے جواہرات اور دیگر معدنیات نکالنے والا کان کن، ہماری گلیوں کی صفائی کرنے والا خاکروب، ریلوے سٹیشنوں اور ٹرانسپورٹ اڈوں پر بوجھ ڈھونے والا قلی، پینے کے پانی کی سپلائی بحال رکھنے والا پلمبر، بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر ہمارے گھر تک بجلی کی روشنی پہنچانے والا لائن مین، الغرض ملک میں رہنے والا ہر محنت کش، ہر فن کار اور سیلز مین اس بات کا حقدار ہے کہ جب وہ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچے تو ان مشقتوں سے اسے نجات ملے اور سماج اس کی بقیہ زندگی کی باعزت کفالت کرے۔ ان تمام محنت کشوں نے ساری عمر اپنی بساط کے مطابق قوم کی اور ملک کی خدمت کی ہے۔ انہیں ان کے بڑھاپے میں بے یار و مددگار چھوڑ دینا ایک آزاد ملک کے لئے باعث شرم اور انسانیت کی تذلیل ہے۔ جب کسی ملک میں آزادی کا روشن سورج طلوع ہو تو اس کی روشنی اور حرارت سے ملک کی تمام آبادی کو یکساں طور پر مستفید ہونا چاہیے۔ آزادی سورج کی سنہری شعاؤں اور باد نسیم

کے فرحت بخش جھونکوں کی طرح ہوتی ہے جو زمین پر بسنے والے ہر مرد و زن، جوان، بوڑھے، گورے، کالے سبھی لوگوں کو یکساں فیض پہنچاتے ہیں۔

ہمارے ملک کے لاکھوں لوگ، ملک کے اندر روزگار کے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے تلاش معاش میں بیرونی ممالک میں جاتے ہیں۔ ان میں سے جن لوگوں کو ترقی یافتہ مغربی ممالک میں جانے اور وہاں کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ایک آزاد معاشرے میں ملک کے ہر شہری کا پیدائش سے لے کر آخری سانس تک کس طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ برطانیہ میں بیروزگاری کے مسئلے سے عہدہ برآہ ہونے کیلئے نیشنل انشورنس سکیم نافذ عمل ہے جس کے تحت ہر برسر روزگار فرد اپنی آمدن کی ایک مقررہ فیصد رقم اس قومی فنڈ میں جمع کراتا رہتا ہے اور جب بھی کوئی شخص بے روزگار ہو جاتا ہے، اسے فوری طور پر اس فنڈ میں سے بے روزگاری الاؤنس ملنا شروع ہو جاتا ہے، جو اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ دوبارہ کام پر نہ لگ جائے۔

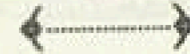
یہ سکیم برطانیہ کے ہر شہری کو ہر قسم کا تحفظ دیتی ہے یعنی نہ صرف یہ کہ بے روزگاری کے دنوں میں اس سکیم کے تحت بے روزگاری الاؤنس بلکہ بیمار ہونے کی صورت میں علاج معالجے کی مکمل سہولیات بھی اسی فنڈ سے بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ریٹائرمنٹ کے وقت اس فنڈ میں سے ہی پنشن جاری ہو جاتی ہے جو تاحیات جاری رہتی ہے۔

برطانیہ میں بیشتر ریٹائرڈ ہونے والے اشخاص دوہری پنشن کے مستحق ہوتے ہیں۔ ایک اس ادارے سے جس میں وہ کام کرتے رہے ہوں۔ دوسری نیشنل سیکورٹی سکیم حکومت برطانیہ کی طرف سے۔ اس طرح ریٹائر ہونے کے بعد بھی لوگ نہایت پر آسائش زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔

اسی طرح یورپ میں کئی دیگر ممالک مثلاً جرمنی، فرانس، ڈنمارک ناروے اور سویڈن وغیرہ میں بھی اس قسم کے نظام معیشت رائج ہیں کہ ہر انسان باعزت زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے۔ اکثر ممالک میں بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کیلئے حکومت کی طرف سے وظیفہ شروع ہو جاتا ہے اور بچوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ وظیفے میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح والدین اپنے بچوں کی پرورش کے مالی بوجھ سے بڑی حد تک آزاد ہو جاتے ہیں۔

برطانیہ میں آج کل اس وظیفے کی شرح تقریباً ساڑھے سات پونڈ فی بچہ فی ہفتہ ہے۔ یہ وظیفہ براہ راست بچے کی ماں کو اس کے گھر پر ملتا رہتا ہے۔ اگر کسی ماں کے چار بچے ہیں تو اسے ہر ہفتہ تیس پونڈ ملتے رہیں گے۔ یعنی آج کل کی شرح مبادلہ کے مطابق تقریباً ساڑھے تین ہزار روپے ہفتہ یا چودہ ہزار روپے ماہوار۔

ایک آزاد فلاحی ریاست Welfare state کی تعریف ہی یہی ہے کہ ریاست قوم کے ہر فرد کی، بچے سے بوڑھے تک، فلاح کی ذمہ دار ہو۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آزادی کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوگا جب تک ہم اپنے وطن کو ایک حقیقی فلاحی ریاست بنانے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ یہ کوئی یوٹوپیائی Utopian تخیل نہیں ہے۔ ایسا ہونا بالکل ممکن نہیں۔ اس کیلئے صرف درست راستے کے تعین اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔







ذات پات اور طبقاتی امتیاز سے آزادی

غلامی کی لعنتوں اور جاگیردارانہ نظام کے اثرات میں سے ایک بڑی لعنت طبقاتی تقسیم، برادری ازم اور ذات پات ہے۔ آزاد ممالک میں تعلیم کی فراوانی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور مثبت اقتصادی منصوبہ بندی کے نتیجے میں سماجی اونچ نیچ اور معاشی ناہمواری کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو جاتا ہے اور آخر کار عوام میں صرف سیاسی نظریات کی بنیاد پر مختلف جماعتوں سے وابستگی کی تفریق باقی رہ جاتی ہے۔

موروثی ملوکیت اور آمریت میں فیوڈل ازم اور سرمایہ داری کیلئے نہایت سازگار ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں معاشرہ خود بخود کئی طبقوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ انگریزوں کی غلامی کے دور میں ایسے لوگ، جنہوں نے سلطنت انگلشیہ سے وفاداریاں نبھائیں، بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن گئے۔ ان جاگیروں پر محنت کرنے والے کسان اور مزدور مشکل سے دو وقت کی روٹی کماتے تھے، جب کہ ان کے مالک عیش و عشرت کی زندگیاں بسر کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے کشمیر کے محنت کشوں اور دست کاروں کی حالتِ زار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔

بہ ریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

یعنی ان کی محنت سے مالکوں کے جسموں پر ریشمی قبائیں سجی ہوئی ہیں جب کہ اس کی قسمت میں تن ڈھانپنے کیلئے چیتھڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

سترھویں صدی کے ہمارے ایک قومی شاعر غنی کاشمیری نے بھی اسی مضمون کو ان الفاظ میں باندھا تھا۔

ہچو سوزن دائم از پوشش گریزا نیم ما
جامہ بہر خلق می دوزیم و عریا نیم ما

یعنی ایک سوزن (سوئی) کی طرح ہم ہمیشہ لباس سے محروم ہی رہے۔ لوگوں کیلئے پوشاکیں سیتے رہے اور خود عریاں رہے۔

غنی کشمیری نے عوام کی زبوں حالی پر اس طرح آنسو بہائے تھے:

روزیٔ ما آخرش گردد نصیب دیگراں
طالع برگشتہ ہچوں آسیہ داریم ما

یعنی ہمارا کمایا ہوا رزق آخر کار دوسروں کا مقدر بن جاتا ہے۔ ہمارا حال تو اس چکی جیسا ہے جو سارا دن اناج پیستی رہتی ہے لیکن اس کے اپنے نصیب میں کچھ نہیں ہوتا۔

الغرض غلامی کی گزشتہ کئی صدیوں میں ہمارا وطن عزیز بھی سماجی طور پر کئی طبقات میں منقسم رہا ہے۔ ایک وہ جاگیردار طبقہ تھا جو مختلف ادوار میں وقت کے حکمرانوں کی خدمات سرانجام دے کر اوران کی خوشنودی حاصل کر کے وسیع جاگیروں کا مالک بن بیٹھا تھا اور اپنے مزارعین کی کمائی پر گلچھرے اڑا رہا تھا۔ ایک مذہبی پیشواؤں کا وہ طبقہ تھا جو ہر دور میں جاگیرداروں کی طرح ارباب اقتدار کا ساتھ دیتا رہا اور ان سے مراعات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دین دھرم کے نام پر غریب عوام کا خون بھی چوستا رہا۔ اسی طبقے کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

دہقاں کو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

ایک بڑے سرمایہ داروں اور تجارتی اجارہ داروں کا طبقہ تھا۔ یہ طبقہ بھی ہر دور میں حاکمان

وقت کا زر خرید غلام بنا رہا اور عوام الناس کی لوٹ کھسوٹ سے اپنی تجوریاں بھرتا رہا۔ یہ سب معاشرے کے ''اعلیٰ'' طبقات کہلاتے تھے اور ان کے مقابلے میں سماج کے ''ادنیٰ'' طبقات تھے۔ جن میں دہقان مزدور اور دستکار وغیرہ شامل تھے۔ جن کی زندگیاں ''اعلیٰ'' طبقات کی خدمت گزاری میں گزرتی تھیں۔ دولت اور قومی وسائل کی غیر منصفانہ اور غیر مساویانہ تقسیم نے نچلے طبقات میں غلامی اور زیردستی کی عادت پیدا کر دی تھی۔ وہ اسے تقدیر کا کھیل سمجھتے تھے اور اپنی زبوں حالی پر قائم رہنے کو ''راضی بہ رضا'' ہونے کا نام دیتے تھے۔

ہندوؤں میں ذات پات کا رواج گزشتہ تین ہزار برس سے جاری ہے۔ ابتدا اس کی جیسے بھی ہوئی تھی۔ بعد میں اس نے مذہبی شکل اختیار کر لی اور اب تک یہ مذہبی شکل میں ہی موجود ہے۔ اس پر ہم ذرا آگے چل کر بات کریں گے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے دین اسلام کی تعلیمات میں تو ایسی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اِنَّا جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

ہم نے تمہارے مختلف قبیلے صرف اس لیے بنائے ہیں کہ تمہاری پہچان ہو سکے۔ تم میں برتر وہی ہے جس کا کردار اچھا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا۔

''لوگو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے (یعنی آدمؑ) عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ برتری صرف تقویٰ کے سبب ہے۔''

لیکن جب ہم مختلف ادوار میں مسلمانوں کے عام چلن پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے۔ ان احکامات کو صرف کتابوں کی زینت بنا کر زبانی جمع خرچ تک محدود کر دیا گیا ہے اور معاشرے میں معاشی حیثیت کی بنا پر درجہ بندی کی گئی ہے اور عملاً ذات پات کا رواج یہاں بھی عام ہے۔ علامہ اقبال نے شکوہ میں محمود و ایاز کے ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی دعویٰ

کیا تھا کہ:

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

لیکن یہ ایک ہی صف میں کھڑے ہونے کا مظاہرہ صرف باجماعت نماز کی صفوں تک ہی محدود رہا ہے۔ کیا کسی نے آج تک کسی سرمایہ دار یا جاگیردار کی ڈائننگ ٹیبل پر بندہ و صاحب و محتاج و غنی کو ایک ہوتے دیکھا ہے۔ مسلمان آٹھ سو سال تک ہندوستان پر حکمران رہے ہیں۔ ان ادوار میں معاشرے کی کیا شکل صورت رہی ہے؟ ملاحظہ فرمائیں:

مؤرخ ضیا الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں غیاث الدین بلبن کی نسلی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سلطان غیاث الدین بلبن تخت نشین ہوا تو اس نے ترک اہل اقتدار کی حمایت حاصل کرنے اور انہیں مطمئن کرنے کی غرض سے نسلی پالیسی کو فروغ دیا اور سختی کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ حکومت اور اقتدار کے کسی شعبے میں بھی دوسری نسل کے افراد کو چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو شریک نہیں کیا جائے گا۔"

برنی ان اقدامات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس نے کسی رزیل، بے کار، کم اصل، کمینے اور پست ہمت شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ بلکہ وہ ایسے لوگوں کے محل کے قریب آنے کا بھی روادار نہ تھا۔ جب تک وہ آدمی کی اصل اور بنیاد کو نہ جان لیتا کوئی شغل یا کام اس کے سپرد نہ کرتا۔"

(تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی ص 77)

یہاں جنرل ضیاء الحق مرحوم کی مجلس شوریٰ یاد آتی ہے۔ مرحوم نے شوریٰ کی رکنیت کی اہلیت کیلئے "اعلیٰ نسل" کا ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ کسی کا "اعلیٰ نسل" سے ہونے کا فیصلہ پولیس رپورٹوں

سے کیا جاتا ہے۔ ضیاء الحق مرحوم اپنی شوریٰ کو مکمل نہیں کر پائے تھے۔ آخری وقت تک اس کی بہت سی نشستیں خالی پڑی رہی تھیں۔ لاہور کے ایک طنزیہ کالم نگار نے اپنے کالم میں لکھا تھا کہ اگر صدر محترم ان نشستوں کو پُر کرنے کا اختیار مجھے دے دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہایت "اعلیٰ نسل" کے افراد کو شوریٰ کا ممبر بنا دوں گا۔

برنی نے بلبن کی نسلی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ قلم بند کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی عہدہ کیلئے ایک شخص کا انتخاب ہوا جس کا نام کمال مہیار تھا۔ بلبن نے اُس سے مہیار کے معنی پوچھے۔ ان نے کہا میرا باپ ہے جو ایک ہندو غلام تھا۔ بادشاہ یہ سنتے ہی غضب کے عالم میں دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔ بعد میں اُس نے اپنے امراء سے کہا:

"میں کسی کم اصل، کمینے، رزیل اور ذلیل کو کسی مرتبہ یا عزت کی جگہ پر نہیں دیکھ سکتا۔ اور جوں ہی اس قسم کے لوگ میرے سامنے آتے ہیں میرے جسم کی تمام رگیں حرکت میں آ جاتی ہیں۔ میں کسی کمین نااہل کے لڑکے کو حکومت میں، جو مجھے خدا کی طرف سے ملی ہے، شریک نہیں کر سکتا۔ اگر اس کے بعد کسی خدمت، خواجگی، مشرفی یا مدبری پر تقرر کے سلسلے میں کسی کمینے، بد اصل یا ذلیل زادہ کو ان کارکنوں نے میرے سامنے پیش کیا چاہے وہ ہزار ہنرمند ہو تو میں ان کے ساتھ وہ برتاؤ کروں گا جس سے دنیا کے لوگ عبرت حاصل کریں گے۔"

(تاریخ فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ ص 90-89)

ضیا الدین برنی "سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ" میں سلاطین کی تعلیمی پالیسی کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"ہر طرح کے اساتذہ کو یہ سختی سے حکم ہوتا ہے کہ وہ کتوں کے حلق میں قیمتی پتھر نہ ٹھونسیں۔ خنزیروں اور ریچھوں کے گلوں میں گلوبند نہ پہنائیں۔ یعنی کمینوں، رزیلوں، نکموں، دوکانداروں اور کم اصلوں کو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ارکان اور قرآن کے کچھ پاروں اور کچھ دینی عقائد سے زیادہ

کی تعلیم نہ دیں۔ جن کے بغیر ان کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ
انہیں کچھ نہ پڑھائیں کہ ان کمین نفوس کو عزت نہ مل جائے"

(سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ۔ ص 122-121)

برنی کا خیال ہے کہ:

"اگر کمین کم اصل ایک سو خوبیوں سے بھی مزین ہو۔ تب بھی وہ ملک کا
نظم ونسق نہیں چلا سکے گا اور سیاسی قیادت واعتماد کا اہل نہیں ہوگا۔"

(ایضاً۔ ص 199)

راقم الحروف کو یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں مضمون نویسی کے ضمن میں جب ملازمت کیلئے درخواست لکھنا سکھایا جاتا تھا تو اس میں ایک جملہ یہ ضرور ہوتا تھا کہ "فدوی کا تعلق...... کے ایک معزز خاندان سے ہے۔"

I belong to a respectable family of

یہ بات بہت بعد میں سمجھ میں آئی کہ معزز اور اعلیٰ خاندان وہ ہوتے ہیں جن پاس دولت ہو، زمینداریاں ہوں، اقتدار ہو۔ نامور مورخ اور دانشور ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

"مذہب، سرمایہ اور اقتدار کی بنیادوں پر بننے والے خاندان وہ استحصالی قوتیں ہیں جو خود کو معاشرے کے دوسرے افراد سے افضل گردانتے ہیں اور لوٹ کھسوٹ میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ مذہبی بنیادوں پر قائم شدہ سیدوں، صوفیوں اور پیروں کے ہیں۔ سرمایہ اور اقتدار کی بنیاد والے خاندان جاگیرداروں، زمینداروں، سرمایہ داروں، اعلیٰ عہدے داروں اور افسروں کے ہیں۔ یہ سب مل کر معاشرے میں خواص کا طبقہ پیدا کرتے ہیں۔"

(تاریخ اور آگہی۔ ڈاکٹر مبارک علی ص 67)

"مغلیہ عہد میں بھی نسلی تفاخر کا بہت خیال رکھا جاتا رہا۔ اعلیٰ ملازمتوں میں وسطی ایشیا اور ایران سے آنے والے خاندانی لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ہندوستانیوں میں سے صرف اعلیٰ راجپوت خاندانوں کو اقتدار میں شریک کیا جاتا تھا۔ خاندانی امراء کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور انہیں رعایتیں دی جاتی تھیں۔ اکبر اعظم نے ایک بار ہدایت جاری کی تھیں کہ قدیم خاندانوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اسلاف اور بزرگوں کے کمالات کو مدنظر رکھ کر ان کے نااہل جانشینوں کا بھی لحاظ رکھا جائے"

(آئین اکبری جلد اول۔ ص 576)

"آئین اکبری میں اعلیٰ و ادنیٰ خاندانوں کے افراد پر جرمانوں کی تفصیلات بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً اگر کم مرتبہ رذیل نے کسی عالی مرتبہ اور شریف شخص کو گالی دی تو اس سے جرمانے کے طور پر 12.5 درہم وصول کئے جائیں گے۔ اگر برابر درجہ کے افراد ایک دوسرے کو گالی دیں تو اس کا نصف اور اگر عالی مرتبت شریف آدمی کسی کم تر آدمی کو گالی دے تو اس کا چوتھائی حصہ وصول کیا جائے"

(آئین اکبری حصہ دوم۔ ص 235)

سماجی طور پر قائم شدہ اس تقسیم نے پیشوں کی بنا پر طبقات کو "ذاتوں" بلکہ "قوموں" میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ سرکاری کاغذات میں اب تک نام اور ولدیت کے بعد قوم کے کالم میں "قوم ماچھی"، "قوم مصلی" وغیرہ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی پیشہ پہلے "ذات" اور پھر "قوم" بن گیا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ایک طرف تو سماج کے بالائی اور با اختیار طبقہ نے عوام الناس کو مختلف "قوموں"، "ذاتوں" اور برادریوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور دوسری طرف منافرت کا یہ عالم ہے کہ جب اس طبقہ کو ضرورت غرض یا مفاد پیش نظر ہوتا ہے۔ جیسے کونسلروں اور اسمبلیوں کے الیکشن وغیرہ تو یہ حضرات اپنی اپنی ذات برادری کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے یکجہتی اور رشتہ داری کے سہارے تلاش کرتے ہیں لیکن سماجی تعلقات میں اپنی ہی برادری یا ذات کے کسی غریب شخص کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔

کسی صاحب حیثیت شخص سے اگر اس کی برادری کا کوئی قریب ترین مفلس رشتہ دار بیٹی یا بیٹے کے رشتہ کی درخواست کرے تو اسے کنگال اور قلاش کے طعنے دے کر بے عزت کر کے گھر سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔

اب ہم ہندوستان میں مروج ذات پات کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

''ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کا آغاز رگ وید کے مطابق 1400 قبل مسیح میں ہوا اور یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ یعنی یہ ورود کسی واحد بڑے حملے کی صورت میں نہیں ہوا بلکہ صدیوں تک وسط ایشیا سے آریاؤں کے قافلے آتے رہے ہیں اور ہندوستان کے اصل قدیم باشندوں کو جنگلوں اور پہاڑوں میں دھکیل کر میدانوں پر قابض ہو گئے۔ آریاؤں کی آمد سے قبل ہندوستان میں کول، دراوڑ، سنتال، بھیل، گونڈ، کاندھ، ناڑ، ٹوڈا، کوٹا، منڈا، ساورا، کوروا، اور چاتگ قبائل کے لوگ آباد تھے۔ جن میں سے کچھ تو آریاؤں کے ساتھ جنگ وجدل میں مارے گئے جو باقی بچے انہیں حملہ آوروں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔''

(اردو زبان کی قدیم تاریخ۔ عین الحق فرید کوٹی۔ ص 96)

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ روئے زمین پر تہذیب سے قبل کا انسان ابتدائی طور پر جنگلوں میں رہ کر صرف شکار پر گزارہ کیا کرتا تھا۔ کسی اور پیشے سے نہ اس کی واقفیت تھی نہ اس میں صلاحیت تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا شعور اتنا بڑھا کہ اس نے بعض کارآمد مویشیوں مثلاً گائے، بھینس، بھیڑ اور بکری وغیرہ کے ریوڑ بنائے اور ان سے خوراک اور لباس دونوں چیزیں حاصل کرنے لگا۔ جن لوگوں نے اس پیشے کو اپنایا وہ سرسبز چراگاہوں کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے رہے۔ اس طرح گلہ بانی یا مویشی پالنا تہذیب کی طرف دوسرا قدم اور انسان کا دوسرا پیشہ بنا۔ زمانہ اور آگے بڑھ گیا تو انسانوں نے سبزیوں، غلے اور پھل دار درختوں کی کاشت کا ہنر سیکھا۔ اس طرح کھیتی باڑی کی ابتدا ہو گئی۔ یہ تمدن کی طرف تیسرا قدم تھا۔ اور زراعت ایک اور پیشہ بن گئی۔ فصلیں اگانے کا راز تاریخ میں پہلی بار عورت نے دریافت

کیا۔ سید علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں کہ:

''مرد شکار کھیلنے جنگل کو چلے جاتے تو عورتیں اناج کے پودوں کی بالیں اکٹھی کرتی تھیں اور پرندوں کی دیکھا دیکھی ان کے دانے رغبت سے کھاتی تھیں۔ عورتوں نے دیکھا کہ جہاں کہیں اناج کے دانے گرتے ہیں وہیں زمین سے انکھوے پھوٹتے ہیں اور ان پودوں کو بچا کر رکھا جائے تو ان کی بالیں دانوں سے بھر جاتی ہیں۔ انہیں ذخیرہ کرنے اور بافراط اگانے کیلئے اپنے جھونپڑوں کے نواح میں زمین کھود کر بیج بونا شروع کر دیا۔''

(تاریخ کا نیا موڑ۔ سید علی عباس جلال پوری۔ ص۔ 16-15)

حیرت کی بات یہ ہے کہ تہذیب وتمدن کے ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود اب بھی دنیا کے مختلف حصوں میں بعض ایسے قبائل موجود ہیں جو اسی قدیم Primative دور میں رہتے ہیں یعنی صرف شکار پر گزارہ کرتے ہیں اور ایسے قبائل تو بہت عام ہیں جو صرف مویشی اور بھیڑ بکریاں پال کر ساری عمر خانہ بدوشی کی حالت میں گزار دیتے ہیں۔

اگرچہ تاریخ میں آریاؤں کی پیش قدمی کا کوئی مبسوط ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ تاہم ''رامائن'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ دریائے گنگا کے کنارے دہلی سے 65 میل شمال مشرق کی طرف ''ہستنا پور'' کے نام سے کوروؤں کی ایک آبادی تھی (کورو، آریاؤں کی شاخ تھے۔) ایک اور بستی کمپلیا کے نام سے قنوج کے قریب واقع تھی۔ اسی طرح بنارس اور پٹنہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ ہند میں قدم رکھنے کے بعد پہلے تو یہ لوگ دریائے سرستی Saraswati اور دریشدوتی کے درمیانی علاقوں یعنی موجودہ پنجاب میں آباد ہو گئے اور پھر مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اودھ اور بہار تک پہنچ گئے۔

سید علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں کہ

''آریاؤں نے دراوڑوں کو شکست دے کر جنوبی ہند کی طرف بھگا دیا۔ ان کے شہر برباد کئے ان کی عورتوں کو داسیاں (باندیاں) بنا لیا۔ لنگ پوجا

"اور دھرتی دیوی کی پوجا کی صورت میں آج بھی ہندومت میں دراوڑی روایات زندہ ہیں آج ہم جس ہندومت کو دیکھتے ہیں وہ دراوڑوں ہی کے مذہب کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ لنگ پوجا کے ساتھ ناگ پوجا بھی دراوڑی روایت ہے۔ ناگ صحیح تاریخ سے حیات نو جنسی ہیجان اور زرخیزی کی علامت رہا ہے۔ فرائڈ اور ژنگ نے اسے لنگ کی علامت قرار دیا ہے۔"

(کائنات اور انسان۔ سید علی عباس جلالپوری۔ ص 181)

آریا ہندوستان کے قدیم باشندوں کے مقابلے میں قد آور، صحت مند، خوش شکل اور مہذب تھے۔ اس کے برعکس یہاں کے قدیم باشندے چھوٹے قد کے اور سیاہ فام تھے۔ چنانچہ ابتدا سے ہی آریا مقامی لوگوں کو اپنے سے کم تر، حقیر اور ناپاک سمجھتے تھے اور ان کو داس، راکھشش اور ناگا کے ناموں سے پکارتے تھے۔ انہوں نے اس قسم کے قوانین مرتب کر رکھے ہیں جن کا مقصد آریاؤں اور قدیم باشندوں Aborigines کے درمیان ایک واضح فرق کو برقرار رکھنا تھا۔

مورخ فریزر کے مطابق

"ہندوؤں کی کم ترین ذات "شودر" اصل میں ان ہی قدیم ہندوستانی باشندوں پر مشتمل ہے۔"

(لٹریری ہسٹری آف انڈیا۔ آر ڈبلیو فریزر۔ ص۔ 153-152)

تاریخ کا ہمیشہ یہ چلن رہا ہے کہ ہر فاتح قوم مفتوح قوم کو اپنے سے کم تر اور حقیر سمجھتی آئی ہے۔ آریاؤں کا نسلی تفاخر کا احساس موجودہ زمانے میں بھی موجود ہے۔ ایران، افغانستان، کشمیر، ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ یورپ کی کئی اقوام بھی آریائی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ سابق شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کو آریائی ہونے پر فخر تھا۔ اسی بنا پر اس نے "آریا مہر" کا لقب اختیار کیا تھا۔ جرمنی کے ڈکٹیٹر اڈولف ہٹلر نے نسلی تفاخر کے جذبہ کے تحت ہی دیگر اقوام کو زیر نگین لانا چاہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ:

"جرمنی کی زندگی کیلئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی قدیم آریائی مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی کو اختیار کرے اور اپنی نسلی برتری کو از سر نو دنیا پر ثابت کرے۔"

(اردو زبان کی قدیم تاریخ۔ عین الحق فرید کوٹی۔ ص 29)

اس تصور کا پس منظر یہ ہے کہ علم البشریات کے نامور عالم چارلس ڈارون نے اپنی تحقیق کے بعد جو نظریات دنیا کے سامنے پیش کیے ان میں سے دو نظریات جہد البقاء یعنی Struggle for existence اور بقائے اصلح یعنی Survival of the fittest نے فکرِ انسانی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جس نے آنے والے دور میں انسانی زندگیوں پر بہت گہرے اثرات ڈالے۔ ان نظریات کا خلاصہ یہ تھا کہ روئے زمین میں زندگی کی قوتیں ہر وقت اپنے وجود کو قائم رکھنے کیلئے مصروف جدوجہد رہتی ہیں اور باقی وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی دوسروں سے زیادہ صلاحیت موجود ہے۔

"بقائے اصلح" کے نظریہ نے ہٹلر کے طرح کئی طاقتور قوموں کو اس احساس میں مبتلا کر دیا کہ وہ دوسروں سے برتر ہیں اس لیے انہیں چھوٹی کمزور قوموں کو تسخیر کرنے اور غلام بنانے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ بقول عین الحق فرید کوٹی:

"پچھلی دونوں بڑی جنگوں کے پس منظر میں بھی نظریات کارفرما نظر آتے ہیں اور آج بھی مغربی اقوام مشرقی دنیا کے خلاف ایک خفیہ محاذ قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں کوریا، ملایا، ویت نام، فلسطین، جنوبی اور شمالی افریقہ کے حالات پر نظر ڈالنا کافی ہے۔"

(اردو زبان کی قدیم تاریخ۔ عین الحق فرید کوٹی۔ ص 29)

ڈارون کے "جہد البقا" کے نظریہ کا ایک تابناک پہلو یہ رہا ہے کہ اس نے عوامی قوتوں میں جہد للحیات کا احساس پیدا کیا اور دنیا کی کمزور و پسماندہ قوموں کے ذہنوں میں یہ اثر ڈالا کہ:

"دنیا میں زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ چنانچہ انہوں نے "زندہ رہنے کی صلاحیت" پر پہنچنے کیلئے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی غلامی کی زنجیریں کے

یکے بعد دیگرے ٹوٹتی چلی گئیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔"

(اردو زبان کی قدیم تاریخ۔ عین الحق فرید کوٹی۔ ص 29)

"تاریخ میں اس بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں کہ برہمن ازم موجودہ حیثیت میں کس طرح پہنچا۔ یعنی برہمن ذات نے معاشرے میں اہم ترین درجہ کیسے حاصل کیا۔ ابتدائی دور میں آریائی اور مقامی لوگوں کے فرق کے سوا ذات پات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ویدانت کے زمانے میں برہمنوں کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس زمانے میں ہر خاندان کا سرپرست خود ہی مذہبی رسوم کی ادائیگی کا کام سرانجام دیتا تھا۔"

(اردو زبان کی قدیم تاریخ۔ عین الحق فرید کوٹی۔ ص 30)

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے فرائض (مصروفیات) میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور رفتہ رفتہ بعض فرائض یا امور پیشہ ورانہ شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ یعنی بعض امور کچھ مخصوص لوگوں سے وابستہ ہو کر رہ گئے جنہوں نے ان کاموں میں مہارت حاصل کر لی اور آخر کار وہ ان کا ہمہ وقتی پیشہ بن گئے۔ برہمنوں کا طبقہ مذہبی پیشواؤں اور معلموں پر مشتمل تھا۔ ان کے ذمے مذہبی رسومات کی ادائیگی، بچوں کو تعلیم دینا اور مندروں اور پاٹھ شالاؤں (مدرسوں) کا انتظام و انصرام تھا۔ پروہت اور استاد دونوں حیثیتوں سے عوام میں ان کا احترام اور اختیار روز بروز بڑھتا گیا۔ اور وہ ایک طاقتور طبقہ کی صورت اختیار کر گئے۔ وہ لوگ جو جنگ و جدل اور امن و امان قائم رکھنے کے معاملات میں عملی حصہ لیتے تھے، کھشتری کہلائے۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ایک طاقتور طبقہ بن گیا۔ تاریخ میں بسا اوقات برہمنوں اور کھشتریوں کے مابین مناقشات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ تاہم اس قسم کے جھگڑوں میں فتح ہمیشہ برہمنوں کی ہی ہوتی رہی ہے۔"

(ہسٹری آف انڈیا۔ ہرسٹ۔ ص 24)

وہ لوگ جنہوں نے زرخیز زمین پر کھیتی باڑی کو اپنا پیشہ بنایا ویش کہلائے۔ برہمنوں اور کھشتریوں نے سماج کے تیسرے طبقے کے طور پر انہیں تسلیم کر لیا۔ چوتھا طبقہ نوکروں، چاکروں اور چھوٹے موٹے کام کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ جنہیں شودر کا نام دیا گیا۔ بعض مورخین کے مطابق جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔ ہند کے قدیم اور اصلی باشندوں کو شودر کا نام دے دیا گیا۔

ویدانت کے زمانے کے برہمن اور منوسمرتی کے زمانے کے برہمن میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ ویدانت کے دور میں برہمن ایک غیر اہم مبہم سی حیثیت کا مالک تھا لیکن منو کے زمانے کے ہندوستان میں برہمن مقتدر ترین حیثیت کا حامل قرار پایا۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی کرتے کرتے برہمن تقدس مآب اور اقتدار کا حامل طبقہ بن گیا اور اسے عوام پر بالادستی حاصل ہو گئی۔ ایسی کہانیاں ظہور میں آنے لگیں کہ برہمن کی ناراضگی کسی شخص کی تباہی کا سبب بن گئی۔ کسی برہمن نے کسی کو بددعا دی اور وہ نشٹ (فنا) ہو گیا۔ حتیٰ کہ سماج کی مختلف طبقوں میں تقسیم یا ذات پات کو ان عناصر نے جنہیں اس سے مفاد حاصل تھا رفتہ رفتہ آسمانی اور مذہبی شکل دے دی۔ حتیٰ کہ مہابھارت کے مطابق:

"برہمن برہما (خالق کائنات) کے سر یا منہ سے پیدا ہوئے ہیں۔
کھشتری اُس کے بازوؤں سے، ویش اُس کی رانوں سے اور شودر اُس
کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔"

(ایضاً۔ صفحہ 22)

منوسمرتی کی تصنیف کے زمانے تک برہمنوں کا طبقہ اختیار حاصل کر چکا تھا۔ انہیں مذہبی معاملات کے علاوہ سماجی انتظام و انصرام پر بھی کامل اختیار حاصل تھا۔ ایودھیا کے عظیم الشان شہر میں برہمن اہم ترین شخصیت کے حامل تھے۔ عبادت گاہوں اور تعلیمی اداروں کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ منو نے برہمن ازم کے ادارے کو معاشرے کا مقدس ترین ادارہ بنا کے رکھ دیا تھا۔ مورخین کے مطابق آج تک دنیا میں کسی بھی نسل یا کسی بھی پیشے نے عوام الناس کے ساتھ اس قسم کے ظالمانہ فرق کو روا نہیں رکھا ہے۔ منو کے مطابق:

"برہمن سے چاہے کوئی بھی جرم سرزد ہو۔ راجہ اسے موت کی سزا نہیں

دے سکتا۔ اسے جلا وطن تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی جان یا مال کو کوئی گزند نہیں پہنچایا جا سکتا۔"

(ہسٹری آف انڈیا۔ ڈبلیو اے ہرسٹ۔ ص 40-39)

"اگر کوئی شودر (قدیم ہندوستانی) کسی آریائی برہمن کو چھو لے جبکہ وہ کھانا کھا رہا ہو تو اس آریائی کو وہ کھانا چھوڑ دینا چاہیے"

(ہسٹری آف انڈیا۔ ڈبلیو اے ہرسٹ۔ ص 40-39)

"اگر کسی شخص نے برہمن کو گھاس کے تنکے سے بھی مارا تو اس شخص کو آواگون کے تحت اکیس جنموں میں ایک چوپائے کی زندگی گزارنی ہوگی۔ اور اگر کوئی شخص برہمن کا خون بہانے کا مرتکب ہوا تو اسے اگلے جنموں میں اتنے سال تک درندوں کی چیر پھاڑ کا شکار ہونا پڑے گا جتنے خاک کے ذرات برہمن کے خون سے آلودہ ہوئے ہوں۔"

(ہسٹری آف انڈیا۔ ڈبلیو اے ہرسٹ۔ ص 40-39)

"کوئی شودر کسی برہمن کی ہمسری کی کوشش کرے تو اسے ہر قسم کے ظلم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شودر ویدوں کی تلاوت سننے کی جسارت کرے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا جاتا تھا۔ اور کسی شودر کو قتل کرنے کی سزا اتنی ہی تھی جتنی ایک کتے کو ہلاک کرنے کی ہو سکتی ہے۔ بادشاہوں کے لیے حکم تھا کہ وہ برہمنوں کی ہر طرح سے نگہداشت کریں اور انہیں دل کھول کر عطیات دیتے رہیں۔"

(ہسٹری آف انڈیا۔ ڈبلیو اے ہرسٹ۔ ص 40-39)

اوپر کی سطور میں اگلے جنموں اور آواگون کا ذکر آیا۔ اس کی وضاحت ضروری ہے۔ سید علی عباس جلالپوری کے مطابق ہندوؤں میں تناسخ ارواح کا تصور قطعاً غیر آریائی ہے۔ رگ وید میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ یہ تصور آریاؤں نے دراوڑوں سے لیا اور کہا کہ انسانوں کی روح اپنے

اعمال کی جزا یا سزا کے نتیجہ میں موت کے بعد نیا چولا بدلتی ہے۔ یعنی انسان نیا جنم لیتا ہے۔ اسے سنسار چکر آواگون (آنا جانا) کہتے ہیں جب تک مکتی یا نجات حاصل نہ ہو روح کو چوراسی لاکھ جنموں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جلال پوری صاحب لکھتے ہیں کہ:

"آواگون نہایت رجعت پسندانہ عقیدہ ہے۔ مکار برہمنوں نے نیچ ذات کو اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ سابقہ جنم کے گناہوں کی پاداش میں انہیں نیچ ورن میں پیدا کیا گیا ہے۔ جب تک ہندوستان میں آواگون کا عقیدہ موجود ہے۔ وہاں کے کروڑوں نیچ ذات والوں کو اصلی انسانی مقام میسر نہیں آ سکتا۔ مسلمانوں میں اسمٰعیلی خوجے بھی آواگون کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ منکر و نکیر مردے سے پہلا سوال یہی کرتے ہیں کہ کیا تم اپنے امام کو پہچانتے ہو۔ جواب نفی میں ہو تو مردے کی روح کو قالب بدلنا پڑتا ہے اور جب تک وہ اپنے امام کی شناخت نہ کرے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔"

(کائنات اور انسان۔ علی عباس جلال پوری۔ ص 141)

برہمنوں نے ابتدا میں گنگا اور جمنا کے دوآبے کو اپنا مستقر بنایا۔ یہاں سے وہ ہندوستان کے سارے علاقوں میں پھیل گئے۔ لیکن ان کی اکثریت اب بھی شمالی ہندوستان میں آباد ہے۔ آر ڈبلیو فریزر لکھتا ہے کہ:

"برہمنوں کا دنیاوی اور روحانی اقتدار اتنا مستحکم ہو گیا تھا کہ منو (منوسمرتی کا خالق) یہ اعلان کرنے کے قابل ہو گیا کہ روئے زمین کے تمام انسانوں کو کوروکشیتر میں پیدا ہونے والے برہمنوں سے اپنے اپنے فرائض سیکھنے چاہیں۔"

(لٹریری ہسٹری آف انڈیا۔ آر ڈبلیو فریزر۔ ص 68)

بعض مورخین کا خیال ہے کہ آریاؤں نے ذات پات کا یہ سسٹم ایران سے لیا۔ جہاں یہ صدیوں پہلے سے موجود تھا۔ حیرت انگیز طور پر ذات پات کا یہ تصور افلاطون کی ری پبلک

Republic سے بھی مماثلت رکھتا ہے جس میں اعلیٰ ترین طبقہ حکمرانوں کا، دوسرا طبقہ فوجیوں کا، تیسرا طبقہ تاجروں کا اور چوتھا طبقہ ادنیٰ ترین غلاموں کا تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دین دھرم، دولت اور اقتدار کے مابین گٹھ جوڑ سے وجود میں آئے ہوئے سماجی طبقاتی نظام اور ذات پات کی لعنت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہر آزادی پسند کی زندگی کا مشن ہونا چاہیے۔ جب تک اپنی سوسائٹی کو اس قباحت سے پاک کرنے کیلئے منظم اور منصوبہ بند طریقہ سے جدوجہد نہیں کی جائے گی۔ ایک صحت مند انسانی معاشرے کے قیام کا خواب تشنۂ تکمیل رہے گا اور حقیقی آزادی کی منزل نظروں سے اوجھل رہے گی۔







معاشرے میں عورتوں کا سماجی اور معاشی مقام

ہم اس باب کا عنوان ''عورتوں کی آزادی'' یا ''عورتوں کیلئے آزادی'' رکھنے لگے تھے۔ لیکن پھر ہمیں خیال آیا کہ جونہی عورتوں کیلئے آزادی کا نام لیا جائے گا، بعض کوتاہ اندیش، تنگ نظر اور رجعت پسند عناصر کی جبینوں پر شکنیں پڑنے لگتی ہیں۔ وہ اسے مغرب زدگی، فحاشی اور عریانی جیسے گھٹیا القابات سے نوازنے لگتے ہیں اور اپنی آنکھوں پر ایک مخصوص سوچ کی عینک چڑھا کر ہر جائز سے جائز بات کو اسی عینک سے دیکھنے لگتے ہیں اس لئے ہم نے اس باب کا عنوان ''معاشرے میں عورتوں کا سماجی اور معاشی مقام'' تجویز کیا ہے۔

- وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔
- عورت اور مرد گاڑی کے دو پہیے ہیں۔
- ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔
- ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔
- اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے۔

اس قسم کے خوبصورت اقوال آئے دن سننے میں آتے رہتے ہیں لیکن ہمارے معاشروں میں عورت کی جو حیثیت ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ انتہائی افسوسناک ہے.....ملوکیت اور طویل جاگیردارانہ نظام نے سماج میں عورت کو بھیڑ بکری اور دیگر اموال کی طرح ایک ''کارآمد شے'' بنا کر رکھ دیا ہے۔ آبادی کا نصف حصہ ہونے کے باوجود معاشرے میں انہیں مرد حضرات نے نہایت ہی کم تر حیثیت دے رکھی ہے۔ پاکستان کی مثال سامنے رکھی جائے تو مردم شماری کے محکمے کے اندازوں کے مطابق اکتوبر 1988ء میں پاکستان کی آبادی دس کروڑ اٹھاون لاکھ اکیاسی ہزار (10,58,81000) تھی۔

جس میں عورتوں کا تناسب اکاون فیصد (51%) تھا متعدد دیگر ممالک کی صورت حال بھی یہی ہے۔ آبادی میں مردوں سے زیادہ تناسب ہونے کے باوجود مرد کے مقابلہ میں عورت کی حیثیت کم تر کیوں ہے؟ یہ بات غور وفکر کی متقاضی ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

یعنی اگر بنی نوع انسان کو ایک جسم تصور کیا جائے۔ تو تمام بنی آدم، مرد وزن، اس جسم کے اعضاء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ خلقی اور پیدائشی طور پر انہوں نے ایک ہی جوہر سے جنم لیا ہے لیکن سماج میں مردوں کی بالادستی نے عورتوں کو مظلوم و مجبور بنا رکھا ہے۔ ان کے ساتھ قدم قدم پر حق تلفی اور ناروا سلوک کی مثالیں ایک انسانی المیہ بن کر رہ گئی ہیں۔ کسی تفصیل میں جائے بغیر ہم عورتوں کی حیثیت کے بارے میں حکومت پاکستان کی سرپرستی میں قائم شدہ کمیشن کی رپورٹ کے ایک اقتباس پر اکتفا کریں گے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے:

"انہیں خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ سرعام پیٹا جاتا ہے، ان کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انہیں بلاخوف وخطر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور قانونی تحفظ کے باوجود انہیں ذاتی ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کی اکثریت روزانہ سولہ تا اٹھارہ گھنٹے کام کرتی ہے اور ستم تو یہ ہے کہ انہیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا......"

1989ء میں بھارتی صوبہ پنجاب کے بارے میں روزنامہ نوائے وقت میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں بتایا گیا کہ پنجاب کی ایک اعلیٰ عہدیدار خاتون مسز بجاج کے ساتھ ایک پارٹی میں پنجاب کے ڈائریکٹر جنرل پولیس مسٹر گل نے بدتمیزی کی اور ان کے کولھے پر ہاتھ پھیرنے کی جسارت کی۔ مسز بجاج نے حکومت سے مسٹر گل کی شکایت کی لیکن دادرسی نہ ہوئی۔ اس کے بعد خاتون نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن عدالت نے بھی ان کا کیس خارج کر دیا۔ جج صاحب کا خیال تھا کہ اگرچہ جرم ہوا ہے لیکن وہ اس قدر معمولی ہے کہ اس پر سزا دینے کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ اب مسز بجاج نے سپریم کورٹ آف انڈیا سے رجوع کیا ہے۔ اس معاملے میں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ پنجاب کے چیف سیکرٹری اور گورنر سدھارتھ شنکر بھی آئی جی پی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی بجائے مسز بجاج پر زور دیتے رہے ہیں کہ اس واقعہ کو بھول جائیں اور کوئی کارروائی نہ کریں۔ لیکن پنجاب میں سیکرٹری کے عہدہ پر فائز مسز بجاج، جن کی ملازمت بیس سال ہو چکی ہے، اپنے موقف پر قائم ہیں کہ وہ آئی جی پی کو سزا دلوا کر رہیں گی۔ وہ کہتی ہیں کہ ہمارے گاؤں میں تو اتنی سی بات پر قتل ہو جاتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار مرد حضرات ایک عورت کے مقابلے میں مرد آئی جی پی کی حمایت کر رہے ہیں۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ 30 جون 1989ء)

ہندوستان میں عورت ذات ہمیشہ جور و جبر کا نشانہ بنی رہی ہے ہندوؤں میں بعض ایسی رسوم رائج رہی ہیں جنہوں نے عورت کو انسانیت کے درجے سے گرا دیا ہے۔ کم عمری میں شادی کا رواج تو اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو وہ ساری عمر شادی نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ اگر کسی کم عمر لڑکی کا شوہر کسی وجہ سے مر جائے تو اسے بھی ساری عمر بیوگی میں گزارنی پڑی ہے۔ ایسی لڑکیوں کو "بال ودھوا" Child Widow کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ خاوند کے مرنے پر بیوی کا اس کے ساتھ ہی ستی ہو جانا۔ یعنی چتا میں جل مرنا ایک اور قدیم رسم تھی جس کی صدائے بازگشت اب بھی کہیں نہ کہیں سنائی دیتی ہے۔

عورت مرد کیلئے ایک خدمت گزار ملازمہ کے علاوہ سامان تعیش کا کام بھی دیتی رہی ہے۔ ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور جاگیرداروں نے سینکڑوں خوبصورت عورتوں پر مشتمل حرم بنا رکھے تھے۔ جن سے وہ اپنی ہوس کی تسکین کا کام لیتے تھے۔ مشہور مصنف لاری کالنز Larry Collins اپنی شہرہ آفاق تصنیف "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ Freedom at midnight" میں تقسیم سے قبل ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان میں بیشتر حکمرانوں کی دلچسپیاں صرف دو چیزوں تک محدود تھیں۔ شکار اور عورتیں۔ مہاراجہ پٹیالہ بھوپندر کے حرم میں تین سو پچاس حسین عورتیں موجود تھیں۔

(فریڈم ایٹ مڈ نائٹ۔ ص 66-163)

بھارت سے اکثر و بیشتر اس قسم کی خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں کہ کم جہیز لانے کے جرم میں دلہن کو زندہ جلا دیا گیا۔ اسی طرح پولیس کے ہاتھوں مجبور دیہاتی عورتوں کی "اجتماعی عصمت دری" کے انسانیت سوز واقعات دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کو چونکاتے رہتے ہیں۔

یہاں پاکستان میں تیل کے چولہے پھٹ جانے سے عورتوں کی "اتفاقی اموات" کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو اس قسم کے واقعات کی تحقیقات کیلئے ایک خصوصی کمیٹی قائم کرنی پڑی تھی۔

قدیم عرب معاشرے میں بھی عورت، بھیڑ بکری اور اجناس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ عورتوں کی خرید و فروخت عام تھی۔ بعض قبائل میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن ظہور اسلام کے بعد عورت کی سماجی حیثیت میں ایک انقلابی تبدیلی آگئی۔ قرآن حکیم نے عورت کو مرد کے مساوی درجہ عطا کیا اور متعدد آیات میں عورتوں کے مساویانہ سماجی مقام کا ذکر کیا۔

قرآن حکیم میں جا بجا مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ خطاب کر کے احکامات نازل کیے گئے۔ سورۃ توبہ کی آیت 71 ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

"مومن مرد اور عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔ یہ لوگ اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں......"

قرآن پاک کی نظر میں برتری اور فضیلت کا معیار صرف ایک ہے کہ

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے برتر اور افضل وہ ہے، جس کے اعمال اچھے ہیں۔

اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ ایک اور آیت میں مردوں اور عورتوں کی برابری کو اس طرح بیان کیا گیا ہے

"کہ تمہاری بیویاں تمہارے لیے مانند لباس کے ہیں اور تم ان کیلئے مانند لباس کے ہو۔"

رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

"لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ (آدمؑ) ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ برتری صرف تقویٰ کے سبب سے ہے۔"

آنحضورؐ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ

"عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ ان سے نرمی اختیار کرو اور مہربانی سے پیش آؤ۔"

بدقسمتی سے خلافت راشدہ کے بعد جونہی ملوکیت کا دور شروع ہوا۔ پرانے سماجی رسوم و رواج پھر عود کر آئے اور عورت پھر اپنی حیثیت کھو بیٹھی۔ نامور دانشور وارث میر مرحوم اپنی تصنیف "کیا عورت آدھی ہے؟" میں لکھتے ہیں:

"عہد ملوکیت میں ہر گھر میں لونڈیاں موجود تھیں۔ ملک کی سرحدیں پھیلتی گئیں اور مفتوحین کی عورتیں لونڈیاں بن کر رہ گئیں لونڈیوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی ان سے نکاح کی ضرورت تھی۔ خلیفہ متوکل عباسی کے پاس چار ہزار کنیزیں تھیں اور ہارون الرشید کے پاس دو ہزار، جن میں تین سو ارباب نشاط تھیں۔ زبیدہ اور ام جعفر برمکی کے پاس کئی ہزار لونڈیاں محض جاہ و جلال کی نمائش کیلئے ملازم تھیں۔ خلفاء، امراء کے گھروں میں لونڈیوں کی بھر مار تھی۔"

"ہارون الرشید نے صرف ایک باندی کی قیمت ایک لاکھ دینار اور سلیمان بن عبدالملک کے بھائی سعید نے ایک لونڈی کی قیمت ستر ہزار دینار ادا کی۔ جعفر برمکی نے ایک لونڈی چالیس ہزار دینار میں اور امین نے "بذل" نامی ایک کنیز کو دو کروڑ میں خریدا تھا۔"

("کیا عورت آدھی ہے؟ صفحہ 30")

پروفیسر وارث میر اسی ضمن میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "یہ کنیزیں تحفہ کے طور پر بھی ایک دوسرے کو پیش کی جاتی تھیں۔ بیشتر عباسی خلفاء جن میں موسیٰ ہادی، ہارون الرشید اور ابو جعفر منصور شامل ہیں، لونڈیوں کی اولاد تھے۔ عربوں نے کنیزوں کی خرید وفروخت کیلئے جو معیار مقرر کر رکھے تھے۔ ان کے مطابق نجابت کیلئے فارس کی لونڈیاں، خدمت کیلئے روما کی، کھانا پکانے کیلئے حبشہ کی، بچوں کی پرورش کیلئے آرمینیا کی، حسن و جمال کیلئے ترکی کی، آنکھوں کے لحاظ سے حجاز کی، اور کمر کے لحاظ سے یمن کی لونڈیاں انمول سمجھی جاتی تھیں۔"

(کیا عورت آدمی ہے۔ پروفیسر وارث میر۔ ص 31)

موجودہ دور میں بھی مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں لڑکیوں کے والدین شادی کے وقت اپنی بیٹیوں کی بھاری قیمت وصول کرتے ہیں۔ اس خرید وفروخت کو بالکل عار نہیں سمجھا جاتا۔ جب سے تیل کی دریافت نے ان لوگوں کو مالا مال کیا ہے۔ اس "تجارت" میں اور زیادہ ترقی ہو گئی ہے۔ مالدار لوگ خوبصورت کنواری لڑکیوں کی بھاری قیمت ادا کر کے انہیں اپنے عقدِ شرعی میں لے آتے ہیں۔ چند سال بعد جب ان سے جی بھر جاتا ہے تو حق مہر ادا کر کے طلاق دے دیتے ہیں اور کسی اور کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ طلاق کو بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مالی لحاظ سے کمزور افراد کسی کنواری لڑکی سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتے بلکہ انہیں امراء سے طلاق یافتہ عورتوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ دور میں عورت ذات دوگونہ بلکہ سہ گونہ غلامی کے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ گھر میں وہ مرد کی غلام ہے، سماج میں سرمایہ دار، جاگیردار اور تنگ نظر ملاؤں نے اسے طرح طرح کی معاشرتی پابندیوں اور رسوم ورواج میں جکڑ رکھا ہے اور حد تو یہ ہے کہ قانون بھی اسے وہ تحفظ مہیا نہیں کرتا جس کا قانون کی کتابوں میں ذکر ہوتا ہے۔ مسز بجاج کا قصہ آپ پڑھ چکے ہیں یہاں پاکستان میں آئے دن حدود آرڈی نینس کے تحت سامنے آنے والے واقعات میں مرد تو صاف بچ جاتا ہے اور عورت بے چاری سزا بھگتنے کیلئے جیل کی کال کوٹھڑیوں میں بند ہو جاتی ہے۔ ملتان کی اندھی لڑکی صفیہ بی بی کا کیس اس سلسلے کا مشہور ترین کیس ہے۔ صفیہ بی بی نے الزام لگایا تھا کہ اس کے مالک مقامی زمیندار اور اس کے بیٹے نے اس کی آبرو ریزی کی ہے لیکن کیس بچے کی پیدائش کے بعد درج کیا گیا۔ "ثبوت" میسر نہ ہونے کی بنا پر دونوں ملزمان کو بری کر دیا گیا جبکہ صفیہ بی بی

کو اپنے حمل کا اعتراف کر لینے کے گناہ کی پاداش میں کوڑے، جرمانے اور قید کی سزا دی گئی۔ خواتین تنظیموں کی طرف سے اس ناانصافی پر زبردست احتجاج کرنے پر وفاقی شرعی عدالت نے اس کیس کو اپیل ہوئے بغیر ہی از خود اپنی تحویل میں لے لیا کیونکہ یہ کیس دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوا تھا اور اس کی وجہ سے بیرونی دنیا میں پاکستان کی بہت بدنامی ہو رہی تھی۔

اب ہم دوبارہ اس بات کی طرف آتے ہیں کہ "ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔" یہ تو کہنے کی بات ہوئی لیکن کیا ہر مرد اس بات پر یقین رکھتا ہے اگر سارے مرد اسی بات پر یقین رکھتے تو آج یہ مقالہ لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی تب ہر مرد اس بات کو تسلیم کر لیتا کہ ہر ماں بنیادی طور پر ایک عورت ہے۔ ایک انسان ہے، اسی طرح کی انسان جس طرح کا وہ خود ایک انسان ہے اور اس کی ماں اس طرح کی ایک عورت جس طرح کی دنیا کی دوسری عورتیں ہیں۔ اگر ہر ماں کے قدموں تلے جنت ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ ہر عورت کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے کیونکہ ہر ماں عورت ہوتی ہے اور اس دنیا میں آتے ہی مرد کا عورت سے جو پہلا رشتہ قائم ہوتا ہے وہ ماں بیٹے کا رشتہ ہوتا ہے۔ گویا ہر مرد ایک عورت کو سب سے پہلے ایک ماں کے روپ میں دیکھتا ہے۔ بہن، بیوی اور بیٹی کے رشتے بعد میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی مرد کی کوئی بہن نہ ہو، کوئی بیوی نہ ہو، کوئی بیٹی نہ ہو۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ کسی مرد کی کوئی ماں ہی نہ ہو۔ یہ وہ اٹل اور لازمی رشتہ ہے جس کے بغیر مرد کا وجود ممکن ہی نہیں۔

ایک محفل میں عورت کی حکمرانی کی بات ہو رہی تھی۔ ایک مولانا نے دلیل دی کہ اگر مرد اور عورت برابر ہوتے تو کوئی عورت نبی نہ ہوتی؟ کیا کوئی عورت پیغمبر آئی ہے؟ ہم نے نہایت ادب سے گزارش کی کہ مولانا یہ تو درست ہے کہ کوئی عورت پیغمبر نہیں ہوئی لیکن یہ بھی درست ہے کہ تمام نبیوں کو جنم عورت نے ہی دیا ہے۔

کس قدر ستم ظریفی کی بات ہے کہ وہ عورت جس کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ بھر جاتے ہیں۔ جو زندگی کے دو پہیوں میں سے ایک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو ماں ہوتی ہے تو اس کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے۔ جب مرد کی بیوی بن جاتی ہے تو وہ اسے اپنا غلام بنا لیتا ہے جاہلوں اور ہوس پرستوں کا یہ قول کس قدر توہین آمیز ہے کہ بیوی پاؤں کی جوتی ہوتی ہے۔ جب چاہا اتار کے پھینک دیا۔ ایک عورت کے بارے میں جو ماں، بہن اور بیٹی بھی ہوتی ہے۔ یہ تصور کرنا کہ جب وہ

کسی مرد کی بیوی ہوتی ہے تو اس کی حیثیت پاؤں کی جوتی کے برابر ہے، انسانیت کی اس سے زیادہ تذلیل نہیں ہو سکتی۔

معروف کالم نگار جناب منو بھائی اپنے ایک کالم میں معاشرے میں عورت کی زبوں حالی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"جہاں اور جب عورت کا معاملہ آتا ہے، ہم وحشی ہو جاتے ہیں بلکہ وحشت کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور زمان و مکان کی سرحدیں عبور کر کے زمانہ جاہلیت کے سیاہ ترین ادوار میں پہنچ جاتے ہیں جہاں بیٹیاں زندہ دفن کر دی جاتی ہیں، بیویاں لونڈیاں بلکہ پاؤں کی جوتیاں سمجھی جاتی ہیں اور ان پر ہر قسم کے ظلم و تشدد کو روا ہی نہیں فرض سمجھا جاتا ہے اور اس ظلم و تشدد سے لطف بھی حاصل کیا جاتا ہے۔"

منو بھائی لکھتے ہیں

"عورت ہمارے معاشرے میں خوف و خطر کی زندگی گزارتی ہے قدم قدم پر تحفظ چاہتی ہے اور سب سے زیادہ غیر محفوظ ہوتی ہے سب سے زیادہ خطرہ اسے مرد سے ہوتا ہے۔ مراٹھی زبان کی ایک شاعرہ کی ایک نظم کچھ یوں ہے۔

میں رات کو سڑک پر جا رہی تھی
سامنے ایک ٹرک آیا
میں نہیں ڈری
سامنے ایک کتا آ رہا تھا
میں نہیں ڈری
سامنے سے ایک مرد آ رہا تھا
میں ڈر گئی

لاہور میں متحدہ علماء کونسل نے 24 اگست 1990 کو اپنے ایک اجلاس میں صدر مملکت اور وزیر اعظم سے مطالبہ کیا تھا کہ سیدہ عابدہ حسین کو وزارت سے برطرف کر دیا جائے ان علماء کی رائے میں عورت کا انتخابات میں حصہ لینا بھی خلاف شریعت ہے۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ 25 اگست 1990ء)

علمائے دین کی اسی متحدہ تنظیم کے کنونشن سے جمعیت اہل حدیث کے رہنما حافظ عبد القادر روپڑی نے 27 اگست کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں فتویٰ دیتا ہوں کہ آج کے بعد جس نے عورت کو ووٹ دیا۔ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ یہ کفر اور اسلام کا مقابلہ ہے۔ ایک طرف عورت اور اس کے ساتھی ہیں جبکہ دوسری طرف حضور اکرم کے شیدائی ہیں۔"

(روزنامہ جنگ لاہور۔ 27 اگست 1990)

لاہور میں ہی جمعیت اہل حدیث کے زیر اہتمام "حرمین شریفین کانفرنس" ہو رہی تھی۔ علمائے کرام کی تقاریر سننے کیلئے کچھ خواتین بھی ہال میں آ گئی تھیں۔ کانفرنس کے سیکرٹری حافظ زبیر احمد نے مائیک پر اعلان کیا کہ خواتین یہاں سے چلی جائیں ساتھ ہی انہوں نے گیٹ پر متعین رضا کاروں کو حکم دیا کہ کسی خاتون کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ چنانچہ ہال میں موجود خواتین کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

پاکستان ٹیلی ویژن پر ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں جماعت اسلامی کے رہبر قاضی حسین احمد کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ مذاکرہ کی کمپیئرنگ کے فرائض سابق ممبر صوبائی اسمبلی محترمہ بشریٰ رحمٰن کو سرانجام دینے تھے۔ جب قاضی صاحب کو اس بات کا علم ہوا تو وہ مذاکرہ میں شریک ہوئے بغیر ہی یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ میں کسی ایسے پروگرام میں شریک نہیں ہو سکتا جس کی کمپیئرنگ کوئی عورت کر رہی ہو۔

(روزنامہ جنگ لاہور 28 اگست 1990ء)

یہ تین چار واقعات صرف چند دنوں کے اندر وقوع پذیر ہوئے تھے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام کے علم برداروں کی نظروں میں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی حیثیت کیا ہو کر رہ گئی ہے۔

جب ہم اس تضاد پر غور کرتے ہیں کہ زبان سے تو عورتوں کے بارے میں مذہب اور قانون کے حوالے سے اتنے بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں لیکن عملی طور پر نصف انسانی آبادی کو مختلف حیلوں بہانوں سے دبائے رکھنے کی کوششیں علی الاعلان ہوتی رہتی ہیں، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑی منافقت ہے۔ جس میں سارا معاشرہ مبتلا ہے۔ دراصل جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور مفاد پرست ملاؤں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور اپنی اس منافقت پر پردہ ڈالنے کیلئے مذہبی احکامات اور قرآن وحدیث کی غلط تاویلیں اور تفسیریں کر کے عوام الناس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک مرد تو کسی بھی رنگ، نسل یا طبقہ کی عورت سے شادی کر لے کوئی اعتراض نہیں لیکن عورت اگر اپنے سے ''کم تر'' حیثیت کے کسی مرد سے اپنی مرضی سے شادی کر لے تو ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ ابھی چند سال پہلے سعودی عرب کی ایک شہزادی نے شاہی خاندان سے باہر کسی نوجوان سے شادی کی تو ان دونوں کو اس ''جرم'' کی پاداش میں سزائے موت دی گئی اور ان کے سر قلم کر دیئے گئے۔ اس واقعہ پر مبنی فیچر فلم Death of a Princess ''ایک شہزادی کی موت'' دنیا بھر میں موضوع بحث بنی رہی۔

مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے اپنی تصنیف ''بہشتی زیور'' میں لکھا ہے کہ:

> ''اگر کسی عورت نے اپنے سے ''کم ذات والے مرد'' سے نکاح کیا اور اس کا ولی ناخوش ہوا تو فتویٰ یہ ہے کہ اس کا نکاح درست نہیں ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں کا ذکر بھی حضرت مولانا تھانوی مرحوم نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ شیخ، سید، انصاری برابر ہیں۔ اگرچہ سیدوں کا رتبہ بڑا ہے۔ مغل اور پٹھان ایک قوم ہیں یہ شیخوں اور سیدوں کی ٹکر کے نہیں۔ جولاہے درزیوں کے برابر ہیں۔ نائی اور دھوبی درزیوں کے برابر نہیں ہیں۔''

(بہشتی زیور۔ حصہ چہارم، ص10)

ماضی میں تو عوام کو مذہب کے نام پر ان کے حقوق سے محروم کیا ہی جاتا رہا ہے لیکن یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ سرسید احمد خان نے کہا تھا:

> ''لوگوں کی بدقسمتی کی وجہ دنیاوی مسائل کو مذہبی مسائل سے الجھانا ہے۔ مذہبی افکار سماجی ضروریات سے قطعی مختلف ہیں۔ سماجی حالات ثقافت اور تہذیبی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے نہ ان کو احکام مذہب میں شامل کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کیا جاسکتا ہے۔''

(ہفت روزہ دوست جلد 1 شمارہ 40 صفحہ 17-16)

اس حقیقت نگاری اور صاف گوئی پر ملاؤں نے سرسید احمد خان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا تھا۔ دور حاضر کے ایک عظیم دانشور انقلاب ایران کے نامور مفکر آقائے آیت اللہ قا آنی نے 1979ء میں جمعہ کے ایک خطبہ میں اس رجحان پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

> ''دنیا میں سب سے خطرناک چیز وہ ہے جو مذہب کے نام پر قوانین اور پابندیوں کے ذریعے لوگوں پر زبردستی نافذ کی جائے۔ یہ وہ جور اور ظلم ہے جو راہبوں نے حکمران طبقات کی اعانت اور تعاون کے ذریعے مذہب کی آڑ لے کر لوگوں پر کیا۔''

(ہفت روزہ دوست جلد 1 شمارہ 40)

اب ذرا سرسیّد احمد خان اور آیت اللہ قا آنی کے ان ارشادات کی روشنی میں پاکستان کے گزشتہ دور کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس طرح مذہب کی آڑ میں انسانوں پر ظلم وجبر روا رکھا جاتا رہا ہے۔

جولائی 1977ء میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''نفاذ اسلام ملک کی سب سے بڑی اہم ضرورت ہے'' اس کے بعد ان کے گیارہ سالہ دور میں ایسی قانون سازی کی گئی جس سے علاوہ اور معاملات کے عورتوں کی حیثیت پہلے سے کہیں کم تر ہو کر رہ گئی۔ حدود آرڈیننس مجریہ 1979ء اور قانون شہادت مجریہ 1984ء سے عورتوں کی سماجی حیثیت پر

بہت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ حدود آرڈی نینس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ قانون شہادت 1984ء کے تحت کسی معاہدے کیلئے ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی لازمی شرط ہے یعنی دو عورتوں کو ایک مرد کے مساوی قرار دیا گیا ہے۔ قصاص اور دیت کے قانون میں بھی عورت کی دیت مرد سے نصف قرار دی گئی۔ چند برس قبل کوٹلی کی ایک عدالت نے ایک عورت کے قتل کے مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے ورثاء کو نصف دیت کا حقدار قرار دیا تھا۔

دیت کے مسئلہ پر پروفیسر وارث میر مرحوم نے اپنی کتاب ''کیا عورت آدھی ہے؟'' میں بہت سے جید علماء کی آراء درج کی ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ دیت کے معاملہ میں عورت اور مرد برابر ہیں۔ ان علماء میں ممتاز عالم دین مولانا حنیف ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالمتین ہاشمی، مولانا عبدالحق محدث دہلوی، پروفیسر طاہر القادری اور جسٹس شمیم حسین قادری وغیرہ شامل ہیں۔

(کیا عورت آدھی ہے؟ از پروفیسر وارث میر ص 161-147)

لیکن اس کے باوجود عورت کی نصف دیت کا قانون نافذ العمل ہے۔ محض اس لیے کہ ایسے کوتاہ اندیش ملاؤں کی ملک میں کمی نہیں جنہوں نے اس قسم کے قوانین بنانے میں حکمران طبقات کی اعانت کی ہے۔ پاکستان کے ایک بہت بڑے عالم دین اپنا زور بیان برسوں اس بات پر صرف کرتے رہے ہیں کہ ملازم پیشہ عورتوں کو ملازمتوں سے الگ کر کے گھروں میں محدود کر دیا جائے۔ وادیٔ کشمیر کے اندر چلنے والی حالیہ تحریک کی ہمہ گیری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض ''بنیاد پرست'' عناصر نے بھی عورتوں پر اسی قسم کی پابندیاں عائد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ یہ حضرات دعویٰ تو آزادی کا کر رہے ہیں لیکن معاشرے میں عورتوں کے مقام کو گھٹا کر گھریلو ملازمہ کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔

امریکی وزارت خارجہ کو ہر سال کانگریس کے سامنے انسانی حقوق سے متعلق ایک رپورٹ پیش کرنی پڑتی ہے۔ یہ رپورٹ ان سب ملکوں میں انسانی حقوق کی صورت حال کا احاطہ کرتی ہے جن کو امریکہ کے بجٹ سے امداد ملتی ہے۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ شفیر نے 1989ء کے بارے میں رپورٹ شائع کی تھی جس میں پاکستان کے بارے میں انسانی حقوق کا جائزہ لیا گیا۔

اس رپورٹ میں علاوہ اور باتوں کے عورتوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی زیادتیوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

''ایک حالیہ جائزے میں بتایا گیا ہے کہ ملتان جیل کی قیدی عورتوں کی 43 فیصد تعداد جیل کے عملے کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔''

''1979ء میں جاری کئے جانے والے حدود آرڈیننسوں کا اطلاق مسلموں اور غیر مسلموں پر یکساں طور سے ہوتا ہے لیکن ان کا زیادہ تر نشانہ عورتیں بنتی ہیں۔ جو افعال اسلامی قانون کے خلاف سمجھے جاتے ہیں ان کیلئے بھاری سزائیں دی جاتی ہیں۔ لمبی قید بہت عام سزا ہے۔ اگست 1989ء میں جو عورتیں سنٹرل جیل میں ڈالی گئیں۔ ان کی دو تہائی تعداد انہی آرڈیننسوں کے تحت آئی۔ لاہور کوٹ لکھپت جیل کی کوئی ساٹھ غریب عورتیں انہی آرڈیننسوں کی مبینہ خلاف ورزیوں کے الزام میں پابند ہوئیں ان میں سے بعض کے پاس ننھے بچے بھی تھے۔ اکثر ایسے ہوا ہے کہ عورتوں نے بالجبر کی شکایت کی لیکن وہ خود ہی زنا کے الزام میں گرفتار کر لی گئیں۔''

''اسلامی لیڈروں کا ایک مضبوط ٹولہ ایک خاتون کو لیڈر تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ خواتین کے خلاف امتیاز کے جواز کیلئے اسلامی احکام کی قدامت پسندانہ تعبیر کرنے پر زور دیتا ہے۔ یہ رواج عام ہے کہ عورت کو شہری، سیاسی اور انفرادی حقوق کے ضمن میں کمتر درجہ دیا جائے۔''

''قرآن کی واضح ہدایات اور سول قوانین میں عورتوں کا حق وراثت موجود ہے۔ لیکن عملاً کئی وجوہات کی بنا پر خاندانی وراثت کا حصہ نہیں کر سکتیں۔ ان رویوں کا نتیجہ ہے کہ بالغ عورتوں کی شرح خواندگی بہت کم ہے۔ مثلاً دیہات میں صرف 4 فی صد، 1983ء میں پرائمری سکولوں میں شرح

داخلہ لڑکیوں کی صرف 23 فیصد تھی۔ حالانکہ لڑکوں کی 64 فیصد تھی۔“

(ہفت روزہ دوست جلد 2 شمارہ 11 صفحات۔ 12-11-7)

چند سال قبل کراچی کی ایک خاتون سوشل ورکر روبینہ رضا نے کراچی جیل کا دورہ کر کے وہاں کی قیدی عورتوں کے بارے میں ”کیا یہ خواتین واقعی مجرم ہیں“ کے عنوان سے اخبار جہاں میں ایک مضمون قلم بند کیا۔ انہوں نے حدود آرڈی ننس کے تحت مقید دو خواتین کے مقدمات کا ذکر کیا۔ شاہدہ پروین اور سکینہ کے مقدمات کی پیروی ضیاء اعوان ایڈووکیٹ (صدر تنظیم برائے انسانی حقوق) نے کی تھی۔ پہلے مقدمے میں شاہدہ پروین کو سنگساری تا مرگ کی سزا سنائی گئی تھی۔ مگر شریعت کورٹ نے اسے غلط قرار دے کر شاہدہ پروین کو رہا کر دیا۔ دوسرے مقدمے میں سکینہ سات سال تک اپنے دو بچوں کے ساتھ حدود کیس میں مقید رہی۔ اس کے پاس وکیل نہیں تھا۔ بعد میں یہ بات عدالت میں سچ ثابت ہوگئی کہ اس پر بنایا گیا کیس صرف ایک ڈرامہ تھا۔ پانچ ماہ کی سماعت کے بعد عدالت نے اسے بری کر دیا۔

سوات کی ایک عورت کو اس کے شوہر نے دو آدمیوں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ وہ اسے کراچی لے آئے اور کچھ عرصہ بعد کسی انجان آدمی کے ہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس آدمی کو جب حالات پتہ چلے تو اُس نے اُسے پولیس کے پاس بھیج دیا۔ وہ عورت خود تھانے گئی اور اُس نے رپورٹ لکھوائی۔ پولیس نے حدود میں اس کا چالان کاٹا اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ اس کی ضمانت کی درخواست پر خود جج صاحب نے لکھا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عورت مجرم کیسے ہوگئی جو خود رپورٹ لکھانے آئی تھی۔

(اخبار جہاں۔ 22 تا 28 جنوری 1990ء ص۔ 16)

اسلامی شریعت میں قذف کا قانون بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت پر بدکاری کا غلط الزام لگائے اور اسے ثابت نہ کر سکے تو شرعی قانون کے تحت اس شخص پر مقدمہ چلا کر اسے سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آج تک عورتوں کے خلاف بنائے گئے حدود کے کتنے ہی مقدمات غلط ثابت ہوئے لیکن ایک مقدمے میں بھی کسی مرد کے خلاف قذف کے تحت کارروائی نہیں کی گئی۔

اب تک ہم نے سماجی پہلو پر گفتگو کی ہے۔ اب ہم ذرا اقتصادی پہلو پر نظر ڈالیں گے۔ یعنی معاشی اور اقتصادی لحاظ سے عورتوں کا مقام کیا ہے۔

1970ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک دستاویز کی منظوری دی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ تعمیر و ترقی کی تمام کوششوں میں عورتوں کی مساوی بنیادوں پر شرکت کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ اور اس بات کیلئے مناسب اقدامات کیئے جانے چاہئیں کہ اس راہ میں حائل سماجی اور انتظامی رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے۔ تمام ممالک کو اس سلسلہ میں ضروری اقدامات عمل میں لانے چاہئیں تاکہ تعمیر و ترقی کے عمل میں عورتوں کو پورا پورا حصہ لینے کی آزادی میسر آئے اور اس کے نتائج اور فوائد حاصل کرنے کا بھی مساوی موقعہ ملے۔

اس دستاویز کی منظوری کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اقوام متحدہ کے مختلف ذیلی اداروں کے جائزوں سے یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ بیشتر ممالک میں خاص کر پسماندہ ممالک میں عورتیں مردوں کے ہاتھوں غیر مساویانہ امتیازی سلوک کا شکار ہیں۔ ان سے مردوں کی نسبت کام زیادہ لیا جاتا ہے لیکن اس کی اجرت سے انہیں محروم رکھا جاتا ہے۔ زراعت کے پیشے سے منسلک عورتوں کے بارے میں جو جائزہ ترتیب دیا گیا اس کے مطابق زراعت سے متعلق امور میں عورتوں کی شرکت افریقہ کے کم آمدنی والے علاقوں میں 87 فیصد بھارت میں 70 فیصد چین میں 74 فیصد اور دیگر کم آمدنی والے ایشیائی ممالک میں 66 فیصد پائی گئی۔

برصغیر میں آبادی کی اکثریت دیہات میں رہتی ہے۔ دیہاتی معاشرے میں عورت پر کام کاج کا بوجھ اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ وہ گھر کے کام کاج اور بچوں کی پال پوس کے علاوہ مردوں کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں بھی کام کرتی ہے۔ اس کی حیثیت ایک غیر اجرتی مزدور کی ہوتی ہے۔ جس کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ گھر کی صفائی ستھرائی کرے۔ کھانا پکائے، کپڑے دھوئے، بچوں کو پالے، گائے بھینس کا خیال رکھے اور پھر کھیتوں میں مرد کا ہاتھ بٹائے لیکن اس کے باوجود ”کماؤ فرد“ کا کریڈٹ صرف مرد کے حق میں جاتا ہے۔ عورت صرف ایک کارکن ہے جبکہ مرد اس کا ”سرداسائیں“، ”سوامی“، ”خاوند“، ”شوہر“ اور ”خصم“ ہے واضح رہے کہ ”سائیں“، ”سوامی“، ”خاوند“، ”شوہر“ اور ”خصم“ سب کے معنی مالک یا آقا کے ہیں۔ وادئ کشمیر میں شوہر عورت کا ”بہتہ خدائے“ کہلاتا ہے۔ یعنی کھانا دینے والا مالک۔

لیکن پیداواری عمل میں مردوں سے زیادہ کردار ادا کرنے کے باوجود عورت کو "باروزگار" یا "کمانے والی" تصور نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اسے House wife گھریلو عورت یا خاتون خانہ کے نام سے پکارا جاتا ہے جس کی اپنی کوئی باقاعدہ آمدن نہیں۔ کاشت کاری سے آمدن کا سارا حق مرد کا تصور کیا جاتا ہے۔ عورت اپنی ضروریات کیلئے مرد کی دست نگر ہوتی ہے۔ شوہر کو بیوی کا کفیل مانا جاتا ہے۔ مرد کو اپنے زیر کفالت افراد کی فہرست مرتب کرنی پڑے تو وہ اپنے بچوں اور عمر رسیدہ والدین کے علاوہ اپنی اس بیوی کو بھی زیر کفالت ظاہر کرتا ہے جس نے پیداواری محنت میں مرد سے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔

بہر حال یہ ایک حوصلہ افزا حقیقت ہے کہ ہمارے معاشروں میں علم و آگہی اور جہالت...... روشن خیالی اور دقیانوسیت...... جدت پسندی اور قدامت پسندی کے درمیان ایک جنگ جاری ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ کمپوٹر کی ایجاد نے ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ٹیکنالوجی نے خاص کر کمپیوٹر کے میدان میں عورتوں کیلئے آگے بڑھنے کے نئے مواقع پیدا کیے ہیں اور ان مواقع کے ساتھ ساتھ ان شعبوں میں خواتین کی شرکت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں خواتین معاشرے میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ کیوں کہ جب تک معاشرے میں ہر لحاظ سے سماجی انصاف قائم نہیں ہو جاتا۔ جب تک ملک میں بسنے والے ہر شہری کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، برابر کے حقوق نہیں مل جاتے۔ خاص طور پر عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع میسر نہیں آتے۔ اس وقت تک حقیقی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر رہے گا۔ ملک کی نصف آبادی کو فرسودہ سماجی بندھنوں میں جکڑ کر اور ان کیلئے ترقی کی راہیں مسدود کر کے، نیز ملک کو ان کی صلاحیتوں سے استفادہ حاصل کرنے سے محروم کر کے ہم تعمیر و ترقی کی منزلیں ہرگز طے نہیں کر سکیں گے۔ جب ہم آزادی کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد پوری قوم کی آزادی ہونی چاہیے صرف نصف قوم کی نہیں۔

علامہ اقبال نے بالکل درست فرمایا تھا

جہاں را محکمی از امہات است
نہاد شاں امین ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نہ داند
نظام کاروبارش بے ثبات است





RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF

اختتامیہ

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں عوام الناس کے ساتھ انسانیت سوز وحشت و بربریت کا سلوک روا رکھا جارہا ہے۔اس کے نتیجے میں انسانی حقوق کی پامالی کی بدترین مثالیں قائم کی جارہی ہیں۔ جنت ارضی جموں کشمیر میں انسانوں کی وہ تمام آزادیاں جن کا ذکر گزشتہ ابواب میں کیا گیا ہے، سلب کرلی گئی ہیں۔ وادئ جموں کشمیر اور ملحقہ علاقوں کے قصبہ قصبہ، شہر شہر، قریہ قریہ، قتل وغارت، جبر و تشدد، خواتین کی اجتماعی آبروریزی، انسانی آبادیوں کی تباہی و بربادی، کئی کئی ہفتے مسلسل جاری رہنے والے کرفیو اور اس کے نتیجے میں بنی نوع انسان پر مسلط ہونے والے مصائب و آلام نے ساری دنیا میں انسانی برادری کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جموں کشمیر کے علاوہ بھارت، پاکستان اور بیشتر بیرونی ممالک میں کشمیری عوام کے انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کیلئے انجمنیں اور تنظیمیں قائم ہوچکی ہیں۔ برطانیہ کی پارلیمان اور امریکہ کے ایوان نمائندگان میں کشمیر کمیٹیاں اور کونسلیں قائم ہوچکی ہیں۔اب کشمیری عوام کو اپنے وطن عزیز کے تباہ شدہ کھنڈرات پر ایک نئے کشمیر کی تعمیر کرنی ہے جس میں رہنے والے انسانوں کو وہ تمام آزادیاں حاصل ہوں جن کیلئے ہزاروں جانیں قربان کی جاچکی ہیں اور جس میں ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ تعمیر و تکمیل پاسکے جو ہر قسم کی تنگ نظری، تعصب، فرقہ وارانہ منافرت، ظلم، جبر اور استحصال سے پاک ہو اور مشرق و مغرب کیلئے محبت، رواداری اور انسانی اقدار کی سربلندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرسکے۔

حال ہی میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 62ویں اجلاس کے موقع پر عالمی اسلامی کانفرنس ”او آئی سی“ (O.I.C) کے رابطہ گروپ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس نے کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کیلئے اپنی حمایت کا اعادہ کرتے ہوئے بھارت اور پاکستان سے کہا ہے کہ وہ تنازعۂ کشمیر کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اجلاس کی صدارت O.I.C کے سیکرٹری جنرل اکمل الدین احسان اوگلو نے کی۔ اجلاس میں ترک وزیر خارجہ علی باباکان، سعودی نائب وزیر خارجہ ترکی الکبیر السعود دنا نجر



RAUF KASHMIRI (CHAIRMEN JKLF)



scanned by
ISRAR MUGHAL (INFO SEC, JKLF

کے اقوام متحدہ میں سفیر عثمان امتاری اور پاکستانی سیکرٹری خارجہ ریاض محمد خان نے شمولیت کی۔ گروپ کی طرف سے کشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا۔ بھارت اور پاکستان پر زور دیا گیا کہ وہ امن کے عمل کو آگے بڑھائیں اور مسئلہ کشمیر سمیت تمام مسائل کو تیزی سے حل کرنے کی کوشش کریں۔ اجلاس نے مقبوضہ کشمیر میں جاری انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بھارت پر زور دیا کہ وہ ان خلاف ورزیوں کو بند کرے اور او آئی سی کے وفد کی مقبوضہ کشمیر آمد کی راہ ہموار کرے۔ او آئی سی کے سیکرٹری جنرل اکمل الدین احسان اوگلو نے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ یہ مسئلہ او آئی سی کے ایجنڈے پر بدستور اولین ترجیح پر ہے۔

پاکستان کے سیکرٹری خارجہ ریاض محمد خان نے کہا کہ کشمیری عوام کو امن عمل میں شامل کیا جائے گا۔ ترک وزیر خارجہ علی بابا کان نے حق خودارادیت کے حصول کیلئے کشمیری عوام کی جدوجہد میں اپنے ملک کی حمایت کا اعادہ کیا۔ سعودی وزیر خارجہ نے بھی تنازعۂ کشمیر کو جلد حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

(روزنامہ آواز۔ 28 ستمبر 2007)

بھارت اور پاکستان دونوں ممالک میں دانشوروں کی خاصی بڑی تعداد ایسی موجود ہے جو یہ سوچ رکھتی ہے کہ کشمیر کا تنازعہ پر امن طریقہ سے تینوں فریقوں (پاکستان، بھارت اور کشمیری عوام) کی مرضی کے مطابق طے ہونے کا وقت بہت قریب آگیا ہے۔ ہم قارئین کے ملاحظہ کیلئے وزیر خارجہ پاکستان خورشید محمود قصوری کا ایک بیان پیش کر رہے ہیں جو انہوں نے نئی دہلی میں منعقد ہونے والی پاک بھارت گول میز کانفرنس سے قبل دیا تھا۔ اور جسے سری نگر سے شائع ہونے والے ایک ہفت روزہ جریدے "سنگر مال" نے نہایت نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ وزیر خارجہ قصوری نے ایک ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا تھا۔

"بھارت اور پاکستان مسئلہ کشمیر کے حل کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں سمجھوتے کو آخری شکل دی جا رہی ہے۔ اب تک بہت کام ہو چکا ہے۔ بعض نکتوں پر جو معمولی اختلافات باقی رہتے ہیں انہیں سلجھانے

کی کوشش ہو رہی ہے۔"

(ہفت روزہ "سنگر مال" سرینگر 29 اپریل 2007ء)

"شاہراہ آزادی" کا آخری باب ہم کشمیری عوام کے ہمدرد اور غم گسار دانشوروں پاکستان کے نذیر ناجی اور بھارت کے کلدیپ نیر کے تازہ ارشادات کی روشنی میں قارئین کے ملاحظہ کیلئے پیش کر رہے ہیں۔

نذیر ناجی روزنامہ جنگ میں اپنے کالم "سویرے سویرے" میں "قابضین کے مذاکرات" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"میرا موقف یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے اپنی قراردادوں میں ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل کے فیصلے کا اختیار خطے کے عوام کو دیا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں ہی اپنے اپنے زیر کنٹرول علاقے میں طاقت کے ذریعے گئے اور وہاں اپنا کنٹرول قائم رکھے ہوئے ہیں۔ کشمیریوں نے اپنی جنگ آزادی میں بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ بدقسمتی سے کچھ عالمی اور علاقائی مذہبی انتہا پسندوں کی دہشت گرد تنظیموں نے مقبوضہ کشمیر کا رخ کیا اور کشمیریوں کی اس جدوجہد آزادی کو جسے عالمی رائے عامہ کی حمایت حاصل ہو رہی تھی اور جسے خود بھارتی عوام بھی برحق محسوس کرنے لگے تھے۔ دہشت گردوں کی وجہ سے عالمی حمایت سے محروم ہو گئی ہے اور دہشت گردوں کی کارروائیوں کو بہانہ بنا کر بھارتی افواج نے وہاں ظلم کا جو بازار گرم کیا وہ آج بھی مقبوضہ کشمیر کے شہریوں کیلئے ڈراؤنے خواب کی طرح جاری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاکستان اور بھارت کشمیری عوام کو علیحدہ رکھ کر کوئی سمجھوتہ کر لیں۔ پاک بھارت مذاکرات کے دوران بھی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سیاچن پر سمجھوتہ اس عمل کی طرف پہلے قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن بنیادی اصول یعنی ڈی ملٹرائزیشن پر اتفاق کے باوجود سمجھوتہ نہیں ہو رہا۔ پاکستان اور بھارت کا موقف زمینی

قبضے پر مبنی ہے۔ اس میں کشمیری عوام کی نہ تو رائے معلوم کی جا رہی ہے۔ اور نہ انہیں اپنی خواہشات ظاہر کرنے کا موقعہ دیا جا رہا ہے۔ کسی بھی خطے کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے وہاں کے عوام کی رائے سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع پر میں اپنے موقف کا بارہا اظہار کر چکا ہوں۔"

"ہندوستان کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے اور پاکستان شہہ رگ۔ دونوں کے موقف میں فرق کیا ہے؟ کشمیر کو یہ لوگ اپنی جاگیر سمجھتے ہیں یا بھیڑ بکریوں کا باڑہ؟ عقل کے ناخن لیں، انسانیت کا سبق پڑھیں۔"

"کشمیر کشمیریوں کا ہے، وہی اس کا فیصلہ کریں گے کہ انہوں نے کہاں جانا ہے۔ لیکن اس کیلئے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اپنی اپنی فوجیں کشمیر سے نکال کر انہیں آزادی سے یہ موقع فراہم کرنا ہوگا۔ کشمیری اب بیدار ہو چکے ہیں۔"

(قابضین کے مذاکرات۔ نذیر ناجی روزنامہ جنگ)

بھارت کے نامور صحافی کلدیپ نیر پاکستان اور کشمیر میں بھی بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں "ایوان وقت" میں سوالات کے جواب دیتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں نہایت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہم ان کی گفتگو میں سے چیدہ چیدہ باتیں قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ کلدیپ نیر نے فرمایا:

"پاکستان اور بھارت مسئلہ کشمیر کے حل پر پہنچ چکے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان مذاکراتی عمل ان کی اپنی ضرورت ہے۔ اس میں امریکہ کا کوئی کردار نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا:

"بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ کو آگے بڑھانا چاہیے۔ علاقائی امن کیلئے ضروری ہے کہ باہمی تنازعات کو مل بیٹھ کر پرامن طریقہ سے حل کر لیا جائے۔"

انہوں نے کہا:

"پاکستان اور بھارت ایک حل پر متفق ہو چکے ہیں۔ دونوں ملکوں کے عوام جنگ و جدل کے خلاف ہیں۔ دونوں ممالک نیوکلیئر (جوہری) طاقت بن چکے ہیں۔ اب اتنی بڑی فوجوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہتھیاروں کی دوڑ ختم ہونی چاہیے۔ دفاع پر اربوں روپے خرچ کرنے کے بجائے یہ رقوم عوام کی بہبود پر خرچ کی جانی چاہیے۔ انہوں نے بھارتی حکومت کو مشورہ دیا کہ اس سلسلہ میں بھارت کو نیک نیتی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دفاع میں 10 فیصد کمی کرنی چاہیے۔"

انہوں نے کہا

"میں سمجھتا ہوں کہ اپنے تنازعات حل کرنے کیلئے خود قدم اٹھایا جانا چاہیے۔ اگر اس خطے میں علاقائی ریجن بنایا جائے تو یہ پورے خطے کی ترقی کیلئے بہت سودمند ثابت ہوگا۔"

انہوں نے مزید فرمایا:

"جموں کشمیر کو ایک ریاست بنا دیا جائے تو علاقائی امن بھی قائم ہو جائے گا۔ اور محاذ آرائی کی جگہ بھائی چارہ کی فضا قائم ہو جائے گی۔"

(نوائے وقت 29 اگست 2007ء)

